امت کی رہبری

آیۃ اللہ جعفر سبحانی

مترجم: سید احتشام عباس زیدی

مجمع جہانی اہل بیت علیہم السلام

فہرست مطالب

عرض ناشر

عالم اسلام کی موجودہ صورت حال ، مسلمان حکومتوں اور ملکوں کا باہم متحد نہ ہونا اسلامی اخوت و مساوات کا فقدان، اسلام اور اسلامی تعلیمات کے بجائے غیر اسلامی تعلیمات کی طرف رجحان اور الٰہی طاقت و قوت پر اعتماد کے بجائے ان کا غیر الٰہی اور کھوکھلی طاقتوں پر ایمان۔ نتیجہ میں استعماری طاقتوں اور عالمی صیہونزم کا ان پر تسلط مسلمانوں کا بے مہابا قتل عام اور ان کے طبیعی و زمینی ذخائر کی اندھا دھند لوٹ کھسوٹ اور ساتھ ہی کلمۂ لا الہ الا اللہ پڑھنے والوں کی بے بسی و بیکسی ایک صائب اور صحیح فکر رکھنے والے مسلمان کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔ ہم چودہ سو سال سے آج تک متفرق کیوں ہیں ۔ مسلمانوں کے درمیان صدیوں سے اس فرقہ واریت کے اسباب کیا ہیں ، مسلمانون میں کلام الٰہی کی یہ عملی تصویر کیوں نظر نہیں آتی جس میں وہ ارشاد فرماتا ہے (اذ کنتم اعداء فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخواناً) بلکہ مسلمان خود ایک دوسرے کے جانی دشمن کیوں بنے ہوئے ہیں کیا ہم عملاً کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی تعلیمات عالم انسانیت کی فلاح کیلئے بہترین تعلیمات ہیں ۔قرآن کے آئیڈیل مسلمان جو (اشداء علی الکفار رحماء بینھم)کی عملی تصویر ہیں پوری اسلامی تاریخ میں انگلیوں پر گننے کے قابل کیوں ہیں۔

اس کا صاف جواب یہ ہے کہ ہمارے پاس آنحضرتؐ کی رحلت کے بعد سے کوئی عملی قرآنی لیڈر شب نہیں رہی مسلمانوں نے ابتدا ہی سے پیغمبر اکرم ﷺ کی رحلت کے بعد نہ قرآنی تعلیمات پر سنجیدگی سے عمل کیا اور نہ پیغمبر اکرم ﷺ کے ارشادات پر کان دھرے اور خدا پسند مسلمان بننے کے بجائے خود پسند مسلمان بنے۔ قرآن کریم کے معلم اول حضرت محمد ﷺ اپنے بعد قرآن کے جن معلموں کو ''حدیث ثقلین''کی روشنی میں ہمارے درمیان چھوڑ گئے تھے مسلمانوں نے ان کے ساتھ جو سلوک کیا وہ تاریخ میں محفوظ ہے اور باہوش مسلمانوں سے پوشیدہ نہیں ہیں۔لہذا ان حالات کی روشنی میں آج بھی یہ بحث تازہ اور گرما گرم ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ جو خدا کی جانب سے بھیجے گئے تھے اور الٰہی تعلیمات اور قرآنی دستور العمل ہماری حیات کیلئے لئے آئے تھے۔ ان کی رحلت کے بعد کیا مسلمان تمام الٰہی تعلیمات اور قرآنی دستور حیات سے اتنے آگاہ ہو چکے تھے کہ انھیں پھر کسی الٰہی معلم قرآن کی ضرورت نہیں رہ گئی تھی اور وہ اپنی

مرضی سے الٰہی نظام حیات کو چلا سکتے تھے؟ دوسرے لفظوں میں کیا وہ خدا سے زیادہ اپنے حالات و معاملات سے آگاہ ہوگئے تھے؟ یا ''عدول'' کا لقب پانے والے آنحضرتؐ کے اصحاب نے خدا ، قرآن اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دستورات کے خلاف خدا و رسولؐ کی مرضی کے بجائے اپنی مرضی کو عملی جامہ پہنایا اور ''امت کی رہبری'' اپنے ہاتھوں میں لے لی۔ انجام کار سامنے ہے کہ مسلمان آج چودہ سو برسوں سے ترقی کے بجائے زوال کی طرف مائل ہیں اور خدا کی جانب سے ''مغضوب'' اور ''ضالین'' شمار کی جانے والی قومیں ان پر غالب ہیں ۔یہ کتاب ''امت کی رہبری'' جو آپ کے ہاتھوں میں ہے اسی موضوع پر آیۃ اللہ شیخ جعفر سبحانی مد ظلہ کی ایک بہترین کاوش ہے جسے موجودہ افکار و خیالات کی روشنی میں نئے رخ سے پیش کیا گیا ہے امید ہے کہ خداوند عالم اس کے ذریعہ حق کے جویا افراد کی ہدایت فرمائے ۔

آمین یا رب العالمین

ناشر

اس کتاب کی تحریر کا مقصد

پیغمبر اکرم ﷺ کی رحلت کے بعد امت کی قیادت ورہبری کا مسئلہ اسلام کے ان اہم مسائل میں سے ہے جس کی تحقیق ہر طرح کے تعصب وغرض و مرض سے دور پر سکون ماحول میں کی جانی چاہئے۔سب سے پہلا مسئلہ جو پیغمبر اسلام ﷺ کی رحلت کے بعد زبانوں پر آیا اور بحث کا موضوع بنا اور آج بھی اس پر بحث و تحقیق جاری ہے وہ پیغمبر اسلام ﷺ کی رحلت کے بعد مسلمانوں کی سیاسی وسماجی قیادت ورہبری کا مسئلہ تھا کیونکہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ ہر جہت سے مسلمانوں کے سرپرست ورہبر تھے ۔ قرآن کی متعدد آیتیں آنحضرتؐ کی وسیع قیادت ورہبری کی گواہی دیتی ہیں جن میں سے بعض آیتیں ہم یہاں ذکر کرتے ہیں:

۱۔ ''اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم[۱]''اللہ،رسول اور اپنے حاکموں کی اطاعت کرو

۲۔ ''النبی اولیٰ بالمؤمنین من انفسھم[۲]''پیغمبر،مومنوں (کی جان ومال)پر ان سے زیادہ سزاوار ہے۔اس وسیع وعریض قیادت ورہبری کا ایک پہلو اسلامی سماج میں عدالت قائم کرنا ہے ۔پیغمبر اسلام ﷺ مدینہ میں اپنے قیام کے دوران خود یا مدینہ سے باہر دوسروں کے ذریعہ سماج میں عدالت برقرار کرتے تھے ۔قرآن مسلمانوں کو حکم دیتاہے کہ اپنے معاملات اور اختلافات میں پیغمبر اکرم ﷺ کے فیصلوں کو بے چون وچرا تسلیم کریں'':فلا وربک لا یؤمنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجا مما قضیت و یسلموا تسلیما[۳]''(تمھارے پروردگار کی قسم وہ لوگ ہرگز مومن واقعی شمار نہیں ہوں گے جب تک وہ اپنے اختلاف میں تمہیں حکَم اور قاضی قرار نہ دیں اوراس پر ذرا بھی ملول نہ ہوں اور تمہارے فیصلہ پر مکمل تسلیم ہوں)پیغمبر اکرم ﷺ کی سماجی رہبری کا ایک پہلو اسلام کے مالی واقتصادی امور کا ادارہ کرناہے کہ آنحضرت اپنی حیات میں ان کاموں کوانجام دیتے تھے۔قرآن مجید نے ان الفاظ میں آپؐ کوخطاب کیاہے'':خذ من اموالھم صدقۃ تطھرھم وتزکیھم بھا[۴]''ان کے اموال میں سے زکوات لو اور اس طرح انھیں پاک کرو۔ دوسری آیات میں زکات اور ٹیکس کی مقدار اور ان کے مصارف کا بھی پوری باریکی کے ساتھ ذکر کیا گیاہے۔ان آیات کے معانی،ان کی

---

[۱] نساء،۵۹
[۲] احزاب،۶
[۳] نساء،۶۵
[۴] سورہ توبہ ،۱۰۳

وضاحت کرنے والی روایات اور خود آنحضرتؐ کا طرز عمل یہ بتاتا ہے کہ آنحضرتؐ مسلمانوں کے سرپرست، سماج کے حاکم، اور ملت وامت کے فرمانروا تھے۔ اور جو سماج کا مطلق العنان حاکم انجام دیتا ہے وہ انجام دیتے تھے ۔ فرق یہ تھا کہ یہ سرپرستی اور حکومت لطف الٰہی کی شکل میں خدا کی طرف سے آپؐ کو عطا ہوئی تھی۔ لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس منصب کے لئے منتخب نہیں کیا تھا۔ نقطۂ حساس یہ ہے کہ ہم یہ جانیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد امت کی باگڈور اور سرپرستی کس کے ذمہ ہے اور اسلامی سماج کی اجتماعی وسیاسی قیادت کس کے ہاتھ میں ہونی چاہئے جو سماج کو ہرج ومرج، فساد اور پسماندگی سے محفوظ رکھے؟ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اسلام جیسے عالمی وجاودانی دستور میں اس امر کو فراموش نہیں کیا گیا ہے اور اس کے لئے ایک بنیادی منصوبہ پیش کیا ہے اور وہ ہے ''اولی الامر'' کی پیروی واطاعت جو ہم پر واجب کی گئی ہے اور اس سلسلہ میں کوئی بحث نہیں ہے۔ پس یہاں جو نکتہ قابل بحث ہے یہ ہے کہ جن حکام کی اطاعت واجب کی گئی ہے مسلمان ان کی شخصیت کو پہچانیں تاکہ خوب اطاعت کریں۔ مسلمانوں کا ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خداوند عالم کے حکم سے اسلامی سماج کے سیاسی واجتماعی امور کو ادارہ کرنے کے لئے اپنے بعد حاکم یا حکام معین کئے ہیں ۔

اس گروہ کے مقابل ایک دوسرا گروہ ہے جو یہ کہتا ہے کہ خداوند عالم نے لوگوں کو یہ اختیار دیا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد اپنے لئے حکام کا انتخاب کریں۔ شیعہ پہلے نظریہ کے اور اہل سنت دوسرے نظریہ کے طرفدار ہیں۔ اگر مسلمانوں کی امامت وپیشوائی کا مسئلہ اسی حد میں ہو کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد اسلام کے اس سیاسی واجتماعی منصب پر کون فائز ہوا، اس شخص کی تعیین کس شکل میں ہوئی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس منصب پر کسی کو معین کیا یا کوئی شخص عوام کی جانب سے اس منصب کے لئے منتخب ہوا، تو یہ بحث صرف ایک تاریخی پہلو کی حامل ہوگی اور چودہ صدیوں کے بعد آج کی نسل کے لئے کوئی خاص سازگار اور مفید نہیں ہوگی۔ (اگرچہ ان افراد کی شناخت بھی اس عہد کے لوگوں کے لئے ضروری اور اہم شمار ہوتی تھی) لیکن اگر بحث کی شکل تبدیل ہو اور یہ کہا جائے کہ بحث کا موضوع پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد اسلامی سماج کی صرف سیاسی و اجتماعی قیادت ہی نہیں ہے بلکہ پیغمبر اکرم

ﷺ اس منصب کے علاوہ ''دین کے اصول و فروع میں بھی مرجعیت ورہبری کا منصب رکھتے تھے ۔تو اب سوال یہ ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ کی رحلت کے بعد اس پہلو کی قیادت کس کے ذمہ ہے؟ اور کیسے اشخاص کو حلال و حرام اور امر و نہی کا منصب دار ہونا چاہئے تا کہ اسلامی حقائق کے سلسلہ میں ان کے اقوال اور نظریات صبح قیامت تک انسانوں کے لئے حجت ہوں؟ اس صورت میں امام کی شناخت اور دینی امامت و پیشوائی کے سلسلہ میں بحث ہر مسلمان کی زندگی کا حصہ قرار پاتی ہے اور کوئی شخص بھی اس معرفت سے بے نیاز نہیں ہوسکتا ۔اب اس مطلب کی وضاحت پر توجہ دیں:

اسلامی معارف و احکام میں قیادت و مرجعیت:

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ پیغمبر ﷺ کی قیادت و رہبری صرف سیاسی و سماجی امور میں نہیں تھی بلکہ آپؐ قرآنی آیات کے مطابق اس الٰہی کتاب کے معلم[1]، قرآن کے مشکل مطالب کی تبیین و وضاحت کرنے والے[2]،اور الٰہی احکام و سنن کو بیان کرنے والے تھے[3]۔اس اعتبار سے پورے اسلامی معاشرہ کا اس پر اتفاق ہے اور قرآنی نصوص بھی گواہی دیتی ہیں کہ اسلام کی اعلیٰ تعلیمات اور بندوں کے فرائض میں آنحضرتؐ کا قول و عمل لوگوں کے لئے سند اور حجت ہے۔اس کتاب کے چوتھے حصہ میں واضح طور سے بیان کیا گیا ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ کی رحلت کے ساتھ لوگوں کی تعلیم و تربیت کی ضرورت پوری نہیں ہوئی تھی اور ابھی اسلام کی علمی و عملی تحریک اپنے کمال کو نہیں پہنچی تھی کہ پھر سماج کو معصوم رہبروں کی ضرورت نہ رہے۔

لہٰذا ضروری ہے کہ رسول خدا کی رحلت کے بعد کوئی شخص یا جماعت اسلام کے احکام اور اس کے علمی،فکری وتربیتی اصول کی رہبری و مرجعیت کا عہدہ اس روز تک سنبھالے جب تک اسلام کا یہ انقلاب پوری طرح سے بارور ہوجائے۔اب دیکھنا یہ ہے کہ اس منصب و مقام کے لئے کون سے افراد شائستہ ہیں تا کہ اسلامی معاشرہ ہر عہد اور ہر زمانہ میں ان کے افکار و کردار و گفتار سے فائدہ اٹھائے۔اور ان

---

[1] ''یعلمهم الکتاب والحکمۃ'' (جمعہ،۲)

[2] ''و انزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما انزل الیهم'' (نحل ،۴۴)

[3] '' وما آتاکم الرسول فخذوه و مانهاکم عنہ فانتهوا'' (حشر،۷)

کی ہدایات و رہنمائی میں حلال خدا کو حرام سے اور واجبات کو محرمات سے تشخیص دے سکے ۔ نتیجہ میں اپنے دینی فرائض پر عمل کر سکے ۔اس گروہ کی شناخت اور ان کی تعلیمات و ہدایات سے آگاہی حاصل کرنا ہر مسلمان پر لازم و ضروری ہے۔ اس کتاب میں اسی بات کی کوشش کی گئی ہے کہ پیغمبر اکرم کے شائستہ اور سچے جانشینوں کا تعارف کرایا جا سکے۔ظاہر ہے کہ (پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد امت کی رہبری)کی بحث کو پیش کرنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ موجودہ حساس حالات میں مذہبی اختلافات کو بھڑکایا جائے یا تعصب آمیز اور بے ثمر و غیر مفید بحث کو جاری رکھا جائے۔

کیونکہ ان حساس اور نازک حالات میں نہ صرف حالات کو پھیلنے سے روکا جانا ضروری ہے بلکہ انھیں کم سے کم کرنے کی کوشش کرنا چاہئے اور در حقیقت انسان کی عمر اس سے کہیں زیادہ قیمتی ہے کہ تعصب آمیز بحث چھیڑی جائے اور اپنی اور دوسروں کی عمر تباہ کی جائے۔بلکہ مقصد یہ ہے کہ ہر طرح کے تعصب و کینہ سے دور رہ کر ایک اہم اور اساسی مسئلہ کو واضح کرنے کے لئے حقائق کی بنیاد پر اس کی محققانہ اور منطقی تحقیق کی جائے۔تا کہ اس کے نتیجہ میں مسلمانوں کے درمیان مزید قربت اور تفاہم پیدا ہو اور وہ زہر افشانیاں ختم ہوجائیں جو ہمارے دانا دشمن اور نادان دوست اس سلسلہ میں کیا کرتے ہیں۔

امت کی رہبری سے مربوط بحثوں میں دو بنیادی اصل ہمارے پیش نظر ہیں: ١۔پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانشینی جیسے اہم مسئلہ میں حقائق و واقعیات کو پہچانا جائے۔

٢۔مسلمانوں کے درمیان مفاہمت اور قربت پیدا کرنے میں مدد کی جائے اور ان عوامل و اسباب کو بر طرف کیا جائے جو سوء ظن کا باعث ہوتے ہیں اور جن سے دشمن فائدہ اٹھا کر ہم میں اختلاف پیدا کرتا ہے۔اس کتاب کے مطالب چند برس پہلے تہران میں یونیورسٹی کے طلبہ کے لئے (حسینیۂ بنی فاطمہ) میں درس کے طور پر بیان کے گئے تھے جو کافی حد تک لوگوں کو مکتب اہل بیت سے آشنا کرنے اور آنحضرت کے شائستہ جانشینوں کی معرفت کا باعث ہوئے تھے۔ جنھیں شائقین کے اصرار پر کتابی شکل میں شائع کیا جارہا ہے یہ کتاب اس بحث کا پہلا حصہ ہے جو ٢٤چوبیس فصلوں پر مشتمل ہے ۔

انشاء اللہ دوسرا حصہ بھی جلد شائع ہوگا ۔ وماتوفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب

جعفر سبحانی

حوزۂ علمیہ قم المقدسہ اسلامی جمہوریہ ایران

مسلمانوں کا اتحاد و یکجہتی ایک ایسی واضح چیز ہے جس کی ضرورت سے کسی بھی عقلمند کو انکار نہیں ہے،کیونکہ جو لوگ ایک کتاب کی پیروی کرتے ہیں اور اساسی و اصولی مسائل پر اتفاق رائے رکھتے ہیں وہ مختلف فرقوں،گروہوں دشمن جماعتوں کی شکل میں کیوں رہیں اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے کیوں ہوں؟اگر ماضی میں لوگوں کے اکثر طبقوں کو اس اتحاد کی ضرورت کا احساس نہیں تھا تو آج جب کہ استعماری طاقتیں اسلامی ممالک کے قلب پر حملہ آور ہیں اور ہر روز آگے بڑھتی نظر آتی ہیں ایسے میں ہر عاقل و ہوشیار شخص کو اتحاد کی ضرورت کا بھرپور احساس ہے۔کون غیرت مند مسلمان ہوگا جو فلسطین،بوسنیہ، کشمیر ،چچنیہ اور دنیا کے دوسرے علاقوں میں مسلمانوں کی ناقابل بیان حالت کو دیکھے اور خون کے آنسو نہ روئے اور اس بے حسی اور پراکندگی پر گریہ نہ کرے؟!

مسلمان، دنیا کی ایک چوتھائی جمعیت کو تشکیل دیتے ہیں۔اورانسانی طاقت ،زمینی ذخائر اور اصیل اسلامی ثقافت کے اعتبار سے دنیا کی سب سے زیادہ غنی جمعیت ہیں ۔ ایسی مادی اور معنوی طاقتوں سے سرشار مسلمان سیاست کے میدان میں سب سے زیادہ باوزن ہو سکتے ہیں اور دنیا کی سیاسی، اقصادی اور ثقافتی قیادت و رہبری اپنے ہاتھ میں لے سکتے ہیں اور استعمار نیز اسلامی اتحاد کے مخالفوں کی بنائی ہوئی بہت سی جغرافیائی حدوں کو نادیدہ قرار دے کر مسلمانوں کی باہمی ضرورتیں پوری کر سکتے ہیں نیز اقصادی و ثقافتی مبادلات کے ذریعہ اپنے حالات بہتر بنا سکتے ہیں ۔اس طرح اپنی سیادت و سرداری دوبارہ حاصل کر سکتے ہیں لیکن اتحاد کی اس اہمیت کو مد نظر رکھنے کے باوجود امام کی شناخت و معرفت کے موضوع کو اسلامی اتحاد کی راہ کا کانٹا نہیں سمجھنا چاہئے اور اسے اس اتحاد کی راہ میں رکاوٹ نہیں سمجھنا چاہئے،جس کی ضرورت کو سبھی محسوس کرتے ہیں ۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ بعض سادہ لوح یا فریب خوردہ جوان اسلامی اتحاد کو حضرت عثمان کا کرتہ بنا کر طالبان حقیقت پر سخت تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں : ابوبکر و علی ؑ کی خلافت کی بحث اور یہ کہ صحیح جانشین کون ہے ایک غیر مفید اور بے ثمر بحث ہے۔اس لئے کہ زمانہ ا پہیا اب پیچھے نہیں گھومے گا اور ہم پیغمبر ﷺ کے حقیقی جانشین کو زندہ نہیں کر پائیں گے کہ اسے اس کا حق دلائیں اور مسند خلافت پر

بٹھائیں اور مخالف کی تنبیہ اور اس کا مواخذہ کریں پس بہتر ہے کہ یہ فائل ہمیشہ کے لئے بند کر دی جائے اور اس کے بجائے کوئی دوسری گفتگو کی جائے!

اس خیال کے حامل افراد اس بحث کے درخشان نتائج سے غافل ہیں لہٰذا انھوں نے اسے غیر اہم ،بے فائدہ اور اسلامی اتحاد کی راہ میں رکاوٹ تصور کیا ہے، لیکن ہمارے خیال سے یہ فکر امام شناسی کے فلسفہ سے غفلت اور لا علمی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے کیوں کہ اگر اس بحث کا مقصد جھوٹے دعویداروں کے درمیان صرف پیغمبر ﷺ کے حقیقی جانشین کا پہچانا ہو تو اس صورت میں ممکن ہے کہ اس طرح کی بحثوں کو غیر مفید و بے ثمر کہیں اور افراطیوں کی طرح جو ہر طرح کی علمی و منطقی بحث کو اسلامی اتحاد کے خلاف سمجھتے ہیں ہم بھی اسے اتحاد کی راہ کا کانٹا سمجھیں ۔اس لئے کہ اب کیا فائدہ ہے کہ چودہ صدیوں کے بعد حق کو ناحق سے تشخیص دینے کی کوشش کی جائے اور غاصب کے خلاف ایک غائبانہ حکم صادر کیا جائے جس کی کوئی عملی ضمانت نہیں ہے ۔

لیکن یہ اعتراض اس وقت بجا ہے جب ہم علمائے اہل سنت کی طرح اسلامی امامت و خلافت کو ایک طرح کا عرفی منصب جانیں جس کا فریضہ اسلامی سرحدوں کی حفاظت کرنا،دفاعی طاقتوں کو مظبوط کرنا، عدل و انصاف کو رواج دنیا، حدود الٰہی کو قائم کرنا اور مظلوموں کو ان کا حق دلانا وغیرہ ہو ،کیونکہ اس صورت میں اس قسم کی بحثوں کی نوعیت یہ ہوگی کہ ہم بیٹھ کر یہ بحث کریں کہ پندرھویں صدی عیسوی میں برطانیہ پر کس شخص کی حکومت تھی یا لوئی پنجم کے بعد تخت حکومت پر بیٹھنے کا حق کس کو تھا؟!

لیکن شیعی نقطہ نظر سے جو امامت کو رسالت کا سلسلہ اور نبوت کے فیض معنوی کا تتمہ سمجھتے ہیں،اس طرح کی بحث لازمی وضروری ہے کیونکہ اس صورت میں امام کے فرائض صرف مذکورہ بالا امور میں ہی خلاصہ نہیں ہوتے ہیں ۔بلکہ ان تمام امور کے علاوہ امام ،حضرت رسول خدا ﷺ کی رحلت کے بعد احکام الٰہی کو بیان کرنے والا،قرآن کی مشکل آیات کا مفسر اور حرام و حلال کو بتانے والا بھی ہے ۔اس صورت میں یہ سوال پیش آتا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی رحلت کے بعد مسلمانوں کو احکام الٰہی کی تعلیم دینے اور حرام و حلال بتانے والا کون ہے تا کہ پیش آنے والے نئے مسائل میں قرآن کی نص اور پیغمبر اکرم ﷺ کی کوئی معتبر حدیث موجود نہ ہونے کی

صورت میں مسلمان اس کی طرف رجوع کریں اور اس کا قول ان موارد میں حجت قرار پائے[1]۔ اصولا اسلامی امت قرآن کے مشکلات اور اختلافی مسائل میں کہ جن کی تعداد محدود بھی نہیں ہے آخر کس صاحب منصب کی طرف رجوع کریں اور کس کے قول و عمل کو اپنی زندگی کے لئے حجت اور چراغ راہ قرار دیں؟ [2]یہی وہ منزل ہے جہاں ہم رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علمی جانشین کے بارے میں بحث کی ضرورت محسوس کرتے ہیں اور یہاں یہ مسئلہ مکمل طور سے زندہ صورت اختیار کرلیتا ہے کیونکہ اس نظریہ کی روشنی میں امام ،الٰہی معارف اور اصول و احکام میں امت کا رہنما ہوتا ہے اور جب تک یہ منصب قطعی دلائل کے ذریعہ پہچانا نہ جائے صحیح نتیجہ تک نہیں پہنچا جاسکتا ۔ اگر مسلمان تمام اصول و فروع میں اتفاق و اتحاد رکھتے تو امامت کے سلسلہ میں بحث اس قدر ضروری نہ ہوتی ،لیکن افسوس کہ ان کے یہاں کم ہی مسائل میں اتحاد پایاجاتا ہے ۔اب ہم جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے چودہ سو سال بعد وجود میں آئے ہیں،ہمارا وظیفہ کیا ہے ؟آیا اس زمانہ میں پیدا ہونے والے مسائل ، مشکلاتِ قرآن اور اختلافی مسائل میں کسی نہ کسی صحابی کی رائے منجملہ (ابوحنیفہ یا شافعی) کی طرف رجوع کریں یا حضرت علی ں اوران کی گرانقدراولاد کی طرف رجوع کریں جن کے لئے شیعوں کا دعویٰ ہے کہ ان کی فضیلت ،عصمت،طہارت، وسیع و عمیق علم اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب سے ان کے منصب امامت پر فائز کئے جانے کے سلسلہ میں عقلی و نقلی دلیلیں موجود ہیں؟

اس سوال کا جواب اسی ''امام شناسی'' کے موضوع اور ولایت کی بحث میں ملے گا جس میں تحقیق ،انسان کو مذکورہ بالا مشکلات میں حیرت و سرگردانی سے نجات دے دیگی۔ حتی اگر ہم مسئلہ خلافت کو بھی چھوڑ دیں اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد مسلمانوں کی سرپرستی و حاکمیت جو حقیقت میں ایک معصوم کا حصہ ہے، سے چشم پوشی کرلیں تو صرف اسی مسئلہ کی تحقیق کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد مسلمانوں کا دینی و علمی مرجع و راہنما کون ہے،بہت سی جہات سے بڑی اہمیت رکھتا ہے اور مسلمانوں کی مکمل سعادت و خوشبختی بھی اس سے وابستہ ہے اس لئے ضروری ہے کہ جو باتیں ہم بعد میں وضاحت کے ساتھ بیان کریں گے یہاں بہت اختصار کے ساتھ ذکر کردیں:

[1] ان مطالب کی تفصیل دوسرے حصہ میں ملاحظہ فرمائیں۔
[2] ان مطالب کی تفصیل دوسرے حصہ میں ملاحظہ فرمائیں۔

اگر ہم اس وقت خلافت و حاکمیت کے مسئلہ سے صرف نظر کردیں تو پورے اطمینان کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ پیغمبر اکرم ﷺ کی مکرر تصریحات و تاکیدات کی روشنی میں آپ کی رحلت کے بعد مسلمانوں کے پاس قرآن کے علاوہ صرف ایک دینی و علمی مرجع و ملجا ہے اور وہ پیغمبر اکرم ﷺ کے اہل بیت علیہم السلام ہیں،کیونکہ آنحضرت نے مختلف موقعوں پر کتاب و عترت کے اٹوٹ رشتہ کو صراحت کے ساتھ بیان کیاہے'': یا أیھا الناس انی یوشک ان ادعی فاجیب و انی تارک فیکم الثقلین کتاب اللہ و عترتی کتاب اللہ حبل ممدود من السماء الی الارض و عترتی اہل بیتی و ان اللطیف اخبرنی انھما لن یفترقا''[1]''اے لوگو!میں عنقریب خدا کی دعوت پر لبیک کہنے والا ہوں۔میں تمہارے درمیان دو گرانقدر اور سنگین امانتیں چھوڑے جارہاہوں ۔ایک اللہ کی کتاب اور دوسری میری عترت ہے ۔اللہ کی کتاب وحی الٰہی اور ریسمان نجات ہے جو آسمان سے زمین تک پھیلی ہوئی ہے اور میری عترت اور اہل بیت۔ ۔ خدائے لطیف نے مجھے خبر دی ہے کہ یہ دونوں ہرگز جدا نہیں ہوں گے''

پیغمبر اکرم ﷺ نے ان دونوں حجتوں کی باہم ملازمت کو دینے آخری حج کے روز عرفہ یا غدیر کے دن منبر سے یا اپنی بیماری کے دوران بستر پر لیٹے ہوئے جب کہ آپ کا حجرہ اصحاب سے بھرا ہوا تھا صراحت سے بیان کیا اور آخر میں فرمایا ہے کہ '':ھذا علی مع القرآن و القرآن مع علی لایفترقان''،یہ علی، ہمیشہ قرآن کے ساتھ ہیں اور قرآن علی کے ہمراہ ہے۔یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے۔حدیث ثقلین کے مدارک اور حوالے ایک دو نہیں ہیں جن کو یہاں ذکر کردیا جائے ۔اس حدیث کے مدارک علامہ میر حامد حسین ہندی نے اپنی گرانقدر کتاب ''عبقات الانوار'' کی بارھویں جلد میں بیان کئے ہیں اور یہ کتاب ہندوستان میں چھپ چکی ہے اور چند سال پہلے چھ جلدوں میں اصفہان میں بھی دوبارہ چھپی ہے،اور دار التقریب مصر سے بھی اس سلسلہ میں ایک کتاب چھپ چکی ہے جس کی بنیاد پر جامعہ الازہر کے سربراہ شیخ شلتوت نے چار مذاہب کی پیروی کے انحصار کو توڑا اور فتوا دیا کہ فقہ امامیہ کی پیروی بھی صحیح اور مجزی ہے۔شیخ شلتوت سے پوچھا گیا کہ بعض لوگوں کا اعتقاد ہے کہ ہر مسلمان پر لازم ہے کہ اپنی عبادات اور معاملات صحیح کرنے کے لئے چار مشہور مذاہب (حنفی،مالکی،شافعی، حنبلی) کی تقلید کرے کہ شیعہ اثنا عشری اور زیدی مذہب ان میں سے نہیں ہیں،کیا جناب عالی بھی

[1] الصواعق المحرقہ،ابن حجر ،فصل دوم باب نہم ،حدیث ۴۱ ص۵۷

اس کلی نظریہ سے اتفاق رکھتے ہیں اور اثنا عشری مذہب کی تقلید و پیروی کو منع فرماتے ہیں ؟ تو انہوں نے جواب میں کہا :

۱۔ اسلام نے اپنے کسی پیروکار پر یہ واجب نہیں کیا ہے کہ (فرعی احکام میں) کسی معین مذہب کی پیروی کرے ۔ہم کہتے ہیں کہ ہر مسلمان کو یہ حق ہے کہ ہر اس مذہب کی پیروی کرے جو صحیح مدارک کے مطابق ہم تک نقل ہوا ہے اور اس کے احکام کو مخصوص کتابوں میں تدوین کیا گیا ہے ۔اسی طرح جن لوگوں نے کسی ایک مذہب کی پیروی کی ہے چاہے وہ جو بھی مذہب ہو وہ دوسرے مذہب کی طرف رجوع کر سکتے ہیں اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

۲۔جعفری مذہب، مشہور اثنا عشری امامیہ مذہب ہے اور ان مذہبوں میں سے ہے کہ اہل سنت کے تمام مذہبوں کی طرح اس کی بھی تقلید کی جا سکتی ہے ۔ل بہتر ہے کہ تمام مسلمان اس حقیقت سے آگاہ ہوں اور کسی خاص مذہب سے تعصب کرنے سے پرہیز کریں کیونکہ اللہ کا دین اور اس کا قانون کسی خاص مذہب کے تابع اور کسی معین و مخصوص مذہب میں منحصر نہیں ہے۔ (اسلامی مذاہب کے پیشوا) سب مجتہدین اور خداوند عالم کے نزدیک مقبول ہیں اور جو لوگ اہل نظر اور صاحب اجتہاد نہیں ہیں ان کے لئے جائز ہے کہ ان حضرات کی تقلید کریں اور جو کچھ انہوں نے فقہ میں مقرر کیا ہے اس پر عمل کریں۔اس سلسلہ میں عبادات و معاملات میں کوئی فرق نہیں ہے[1]۔لہٰذا امامت کی حقیقت کے سلسلے میں علماء کے یہاں دو نظریئے پائے جاتے ہیں ایک نظریہ اہل سنت کے علماء کا ہے اور دوسرا شیعہ علماء کا نظریہ ہے:

الف۔ علمائے اہل سنت کا نظریہ:

علمائے اہل سنت کی عقائد و کلام کی کتابیں اس بات کی حکایت کرتی ہیں کہ امامت ان کی نظر میں وسیع پیمانہ پر مسلمانوں کے دینی و دنیوی امور کی سر پرستی ہے اور خود ''امام ''اور ان کی اصطلاح میں ''خلیفہ'' وہ شخص ہے جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی رحلت کے بعد اس

[1] رسالۃ الاسلام،طبع مصر ،شمارہ سوم،گیارھواں سال

خلافت ،علمائے اہل سنت کی نظر میں ،ایک ایسا اجتماعی و سماجی عہدہ و منصب ہے جس کے لئے اس سے مخصوص مقاصد کی لیاقت و شائستگی کے علاوہ کوئی اور شرط نہیں ہے.جب کہ شیعی نقطۂ نظر سے امامت ایک الٰہی منصب ہے جس کا تعین خدا کی طرف سے ضروری ہے اور وہ بہت سے حالات اور ذمہ داریوں میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر و یکساں ہے۔

منصب کا ذمہ دار ہے اور مسلمانوں کے دینی و دنیاوی امور سے مربوط ہر گرہ اسی کے ذریعہ کھلتی ہے۔ یہ علماء ،امامت کی یوں تعریف کرتے ہیں ''؛ الامامۃ رئاسۃ عامۃ فی امور الدین و الدنیا خلافۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم''[1] اہل سنت کے نظریہ کے مطابق یہ عظیم دینی و اجتماعی عہدہ و منصب ایک سماجی بخشش ہے جو لوگوں کی طرف سے خلیفہ کو عطا ہوئی ہے اور خلیفہ انتخاب کے ذریعہ اس مرتبہ پر فائز ہوا ہے ۔ خلیفہ کی ذمہ داریوں کا دائرہ بھی مذکورہ تعریف میں پورے طور سے مشخص کر دیا گیا ہے۔

الف: ۔ دینی امور کی سرپرستی : اس سے مراد یہ ہے کہ لوگوں کے دینی مشکلات خلیفہ کے ہاتھوں حل ہوتے ہیں مثلا پوری دنیا میں جہاد کے ذریعہ اسلام کی توسیع ایک دینی امر ہے جس کا عہدہ دار امام کو ہونا چاہیئے ۔

ب: ۔ دنیاوی امور کی سرپرستی : امام و خلیفہ کو چاہیئے کہ طاقت کے ذریعہ عمومی امن و امان قائم کرے اور لوگوں کے اموال ان کی ناموس اور ملک کی سرحدوں کی حفاظت کرے ۔اس تعریف اور خلیفہ کے سپرد کی گئی ذمہ داریوں پر غور کرنے سے ایک حقیقت سامنے آتی ہے اور وہ یہ کہ امام یا خلیفہ ان کے نقطہ نظر سے ایک فرعی اور ایک سماجی حاکم ہے جو ملکی قوانین کا اجراء کرنے عمومی امن و امان قائم کرنے اور سماجی عدل وانصاف برقرار کرنے کے لئے منتخب ہوا ہے اور اس طرح کی حاکمیت کے لئے لیاقت و شائستگی کے علاوہ کسی اور چیز کی شرط نہیں ہے (نہ اسلامی احکام کے کلی و وسیع علم کی ضرورت ہے اور نہ سہو وخطا سے معصوم ہونے کی ضرورت ہے)دوسرے لفظوں میں کوئی بھی معاشرہ چاہے جتنا بھی گناہ اور فساد سے پاک ہو پھر بھی برائی پورے طور سے اس سے دور نہیں ہوتی اور کہیں نہ کہیں گوشہ و کنار میں ایسے شریر افراد ضرور نظر آتے ہیں اس کے علاوہ اور بھی تعریفیں علماء اہل سنت نے بیان کی ہیں لیکن اختصار کے پیش نظر ہم ان سے گریز کرتے ہیں۔ جو جوا و شراب کی طرف ہاتھ بڑھاتے نظر آتے ہیں یا لوگوں کے عمومی اموال و جائداد پر زبردستی ڈاکاڈالتے ہیں اور ان پر قابض ہو جاتے ہیں یا لوگوں کی عزت و ناموس پر حملے کی فکر میں رہتے ہیں۔اس لئے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد ایک ایسے شائستہ و لائق شخص کی ضرورت ہے جو گناہ گاروں اور فسادیوں کی الٰہی قانون کی روشنی میں تنبیہ کرکے اس طرح کی برائیوں اور آلودگیوں کو روکے ۔یہ اور اسی طرح کے امور وہ ہیں جو انسان کی دنیا سے مربوط ہیں، جن کی سرپرستی پیغمبر

[1] شرح تجرید ،علاء الدین قوشجی ص،۴۷۲۔

ﷺ کی رحلت کے بعد امام کے حوالے کی گئی ہے۔ مذکورہ امور کے مقابل کچھ دوسرے امور بھی ہیں جو دنیا میں اسلام کی ترقی اور پھیلاؤ سے مربوط ہیں اور جن کا تعلق انسان کے دین سے ہے ۔ مثلاً امام کا ایک فریضہ یہ ہے کہ اسلحوں سے لیس ایک منظم اور مضبوط فوج تیار کرے جو نہ صرف اسلامی سرحدوں کو ہر طرح کے باہری حملوں سے محفوظ رکھے بلکہ اگر ممکن ہو تو جہاد کے ذریعہ توحید کا پیغام پوری دنیا میں پھیلا سکے۔ اب یہاں آپ یہ کہیں گے کہ پھر لوگ اپنے حرام و حلال اور دینی و علمی مسائل کس سے دریافت کریں گے، اور اس عہدہ کا ذمہ دار کون ہوگا ؟ تو اس کے جواب میں علمائے اہل سنت کہیں گے کہ اصحاب پیغمبر ﷺ جنھوں نے آنحضرت سے حرام و حلال کے احکام سیکھے ہیں اس طرح کے مسائل میں امت کے مرجع ہیں ۔

اگر امام کی ذمہ داری ان ہی امور کی دیکھ بھال میں منحصر ہو، جنھیں ہم نے اہل سنت کی زبانی نقل کیا ہے، تو ظاہر ہے کہ ایسے امام کے لئے صرف تھوڑی سی لیاقت و شائستگی کے علاوہ کسی بھی اخلاقی فضیلت اور انسانی کمال کی ضرورت نہیں ہے، چہ جائیکہ اس کے بارے میں وسیع علم اور خطا و گناہ سے بچانے والی عصمت کی شرط رکھی جائے۔ افسوس کہ امام کا معنوی و روحانی مرتبہ و منصب اہل سنت کی نظر میں رفتہ رفتہ اس قدر گر گیا کہ قاضی باقلانی جیسا شخص پیغمبر اکرم ﷺ کے جانشین کے بارے میں اس طرح کی باتیں کرتا ہے کہ خلیفہ و امام پست ترین اخلاقی خصلتوں کی غلاظت اور اپنے کالے سیاسی کارناموں کے باوجود امت کی قیادت و رہبری کے منصب پر باقی رہ سکتا ہے ،وہ کہتا ہے '' : لا یخلع الامام بفسقہ و ظلمہ بغصب الاموال و تناول النفوس المحترمۃ و تضییع الحقوق و تعطیل الحدود''[1]،یعنی امام اپنے فسق و فجور اور ظلم کے ذریعہ ،لوگوں کے اموال غصب کرکے ، محترم افراد کو قتل کرکے ،حقوق کو ضائع کرکے اور الٰہی حدود و قوانین کو معطل کرکے بھی اپنے منصب سے معزول نہیں ہوتا بلکہ یہ امت پر ہے کہ اس کی برائیوں کو درست کریں اور اس کی و ہدایت کریں! اور ہمیں مزید تعجب نہ ہوگا اگر ہم محقق تفتازانی جیسے عالم کو خلیفۂ پیغمبر ﷺ کے بارہ میں ایسے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے دیکھیں،وہ لکھتے ہیں:یہ ہرگز ضروری نہیں کہ امام لغزش اور گناہ سے پاک ہو یا امت کی سب سے اعلیٰ فرد شمار ہو۔ امام کی نافرمانی اور الٰہی احکام سے

[1] التمہید ص،۱۸۶

اس کی جہالت منصب خلافت سے اس کی معزولی کا سبب ہرگز نہیں ہوسکتی.[1] اسلام کے بارے میں اس طرح کے فیصلوں اور نظریوں کی بنیاد یہ ہے کہ ان لوگوں نے امام کو ایک عرفی اور انتخابی حاکم سمجھ لیا ہے ۔کیونکہ ایک عرفی حاکم کے لئے بنیادی شرط یہ ہے کہ وہ نظام کو چلانے اور معاشرہ میں آرام و سکون برقرار کرنے کی لازمی صلاحیت رکھتا ہو اور فسادیوں کو کنٹرول کر سکے ۔خود اس کا گناہ سے آلودہ ہونا یا اس کی غلطیاں اس منصب کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتیں جس کے لئے وہ منتخب ہوا ہے ۔

ب۔ شیعہ علماء کا نظریہ:

مذکورہ بالا نظریہ کے مقابل ایک دوسرا نظریہ بھی ہے جس پر شیعہ علماء تکیہ کرتے ہیں ۔یہ نظریہ کہتا ہے کہ :امامت ایک طرح کی الٰہی ولایت ہے جو خداوند عالم کی جانب سے بندہ کو دی جاتی ہے۔ واضح الفاظ میں یوں کہیں کہ : امامت،نبوت کی طرح ایک انتصابی منصب ہے اور اس کا عہدہ دار خود خدا کی طرف سے،معین و منصوب ہوتا ہے ۔اس بنیاد پر امام رسالت ہی کا سلسلہ ہے فرق یہ ہے کہ پیغمبر شریعت کی بنیاد رکھنے والا اورآسمانی پیام لانے والاہے اور امام شریعت کو بیان کرنے والا اور اس کا محافظ و نگہبان ہے ۔امام، نزول وحی کے علاوہ تمام مراتب میں پیغمبر اکرم ﷺ کے برابر اور قدم بقدم ہے اور وہ تمام شرائط جوپیغمبر ﷺ کے لئے ضروری و لازم قرار دیے گئے ہیں (مثلاً اسلام کے معارف،اس کے اصول و فروع اور احکام کا علم اور ہر طرح کی خطاو گناہ سے اس کا محفوظ ہونا) بعینہ امام کے لئے بھی لازم و ضروری ہیں۔

یہ نظریہ رکھنے والے معتقد ہیں کہ: صحیح ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ لوگوں کے لئے مکمل دستور حیات لائے اور انہوں نے اسلامی تعلیمات اور دین حق کے تمام کلیات لوگوں کے حوالے کردئیے لیکن پیغمبر اکرم ﷺ کی حیات کے بعد کوئی تو ایسا شخص ہونا چاہئے جو ان کلیات سے جزئی احکام کو استنباط کرے اورنکالے اور یہ کام علم (اور وہ بھی وسیع اور خدا داد علم)کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ صحیح ہے کہ اسلام کے تمام احکام کی تشریح پیغمبر ﷺ کے زمانہ میں ہوئی ہے اور یہ احکام وحی الٰہی کے ذریعہ انھیں بتائے گئے ہیں۔ لیکن مساعد حالات نہ

[1] شرح مقاصد ،ج۲،ص۲۷۱

ہونے یا روزانہ پیش آنے والے نئے مسائل کے حل کے لئے احکام کا بیان امام کے ذمہ بھی کیا گیا ہے ،اور اس منصب کا سنبھالنا اللہ سے وابستہ اور مستند علم کے بغیر ممکن نہیں ہے۔اسی لئے شیعوں کا اعتقاد ہے کہ امام کو شریعت کے تمام امور سے واقف و آگاہ ہونا چاہئے[۱]۔لیکن امام معصوم کیوں ہو؟تو جواب یہ ہے کہ شیعہ امام کو امت کا معلم و مربی جانتے ہیں اور تربیت سب سے زیادہ عملی پہلو رکھتی ہے اور مربی کے عمل کے ذریعہ انجام پانی چاہئے۔اگر مربی خود قانون توڑنے والا اور حدود کو پھلانگنے والا نہ ہوتو لوگوں پر مثبت اثر کیسے ڈال سکے گا؟لہٰذا یہ نظریہ کہتا ہے کہ امت کے لئے ایسے شخص کی شناخت وسیع و خداداد علم اور ہمہ جہت عصمت کے ذریعہ ہی ممکن ہے اور امام کو خدا کی جانب سے منصوب ہونا چاہئے۔یہ دو نظریے ہیں جو ان دونوں گروہوں کے علماء کے ذریعہ بیان ہوئے ہیں۔اب ہم دیکھیں کہ ان میں سے کون سا نظریہ صحیح و استوار نیز قرآنی آیات اور پیغمبر اکرم ﷺ کی معتبر حدیث سے سازگار ہے۔

عقلی اور نقلی دلائل گواہی دیتے ہیں کہ امامت کا منصب نبوت کے مانند ایک الٰہی منصب ہے اور امام کو خدا کی جانب سے معین ہونا چاہئے اور جو شرائط پیغمبر ﷺ کے لئے (وحی اور بانیٔ شریعت ہونے کے علاوہ) معتبر ہیں وہ امام میں ہونے چاہئے۔اب ہم دلائل کا جائزہ لیتے ہیں:

پیش آنے والے نئے مسائل:

پیغمبر اکرم ﷺ نے اپنی حیات طیبہ میں اسلام کے اصول و فروع کے تمام کلیات بیان کردئیے تھے اور اسلام اسی طریقہ سے خود پیغمبر اسلام ﷺ کے ہاتھوں تکمیل پایا۔لیکن کیا یہ اصول و کلیات امت کی علمی ضرورتوں کو پورا کرنے والی کسی مرکزی علمی شخصیت کے بغیر کافی ہیں؟یہ طے شدہ بات ہے کہ کافی نہیں ہیں۔بلکہ آنحضرتؐ کے بعد ایسے معصوم پیشواؤں کی ضرورت ہے جو اپنے وسیع و بے پایان عظیم علم کے ذریعہ کلیات قرآن و اصول اور سنت پیغمبر ﷺ کی روشنی میں پیش آنے والے مختلف مسائل میں امت کی علمی ضرورت کی تکمیل کریں۔خصوصاً ایسے مسائل میں جو پیغمبر ﷺ کے زمانہ میں پیش نہیں آئے تھے اور نہ حضرتؐ کے زمانہ میں اس کی کوئی مثال ملتی

[۱] چونکہ شیعہ علماء اہل سنت کے نظریہ کے برخلاف ،امامت کو ایک الٰہی منصب سمجھتے ہیں لہذا وہ امامت کی یوں تعریف کرتے ہیں ''الامامۃ رئاسۃ عامۃ الٰھیۃ فی امور الدین و الدنیا و خلافۃ عن النبی ؐ''امامت لوگوں کے دینی و دنیاوی امور میں ایک عام الٰہی سرپرستی اور پیغمبر ﷺ کے جانشینی ہے۔

ہے۔دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنی بعثت کے بعد رسالت کے تیرہ سال مکہ میں بت برستوں کے خلاف جدو جہد میں بسر کئے۔اور اس عرصہ میں حالات اور ماحول سازگار نہ ہونے کی وجہ سے آپ الٰہی شریعت کے احکام بیان کرتے میں کامیاب نہ ہوئے بلکہ آپ نے اپنی پوری توجہ اسلامی اصول و مبدا اور معاد یعنی توحید و قیامت کے سلسلہ میں لوگوں کا ذہن ہموار کرنے میں صرف کی،اور چونکہ حرام و حلال اور الٰہی فرائض و سنن بیان کرنے کے حالات نہیں تھے،لہٰذا آپ نے احکام کے اس حصہ کو بعد کے لئے اٹھا رکھا۔

جب آنحضرت مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپ کے سامنے مسائل و مشکلات کا ایک لشکر تھا۔مدینہ میں آپ کی زندگی دس سال سے زیادہ نہ رہی لیکن آپ نے اسی مدت میں ستائیس مرتبہ خود بت پرستوں نیز مدینہ اور خیبر کے یہودیوں کے خلاف جنگوں میں شرکت فرمائی ۔دوسری طرف منافقوں کی سازشوں نیز اہل کتاب سے مناظرہ و مجادلہ میں بھی آپ کا بڑا قیمتی وقت صرف ہوا۔یہ حادثات و واقعات سبب بنے کہ پیغمبر اکرم ﷺ اپنی رسالت کے دوران زیادہ تر اسلام کے فروع و احکام کے کلیات بیان کریں اور ان کلیات سے دوسرے احکام کے استنباط و استخراج کا کام دوسرے شخص کے حوالے کیا جائے۔

اگر قرآن یہ فرماتا ہے کہ ''الیوم اکملت لکم دینکم''[1] تو اس سے پیغمبر اکرم ﷺ اور اسلام کی اس وقت کی حالت و کیفیت کو دیکھتے ہوئے آیت کے نزول یعنی دس ہجری کے وقت مراد یہ ہے کہ توحید و قیامت سے متعلق معارف و عقائد اور فروع و احکام کے تمام اصول و کلیات آیت کے نزول کے وقت خود پیغمبر اکرم ﷺ کے ہاتھوں تکمیل ہوگئے اور اس اعتبار سے دین کے ارکان میں کوئی نقص باقی نہیں رہا اور یہی کلیات صبح قیامت تک امت کو پیش آنے والے مسائل کا حل تلاش کرنے میں بنیاد و اساس کا کام کریں گے۔اب یہ دیکھنا چاہئے کہ کون سا شخص ان اصول و کلیات کے ذریعہ اسلامی معاشرہ کی تمام ضرورتوں اور مسائل کا جواب دے سکتا ہے۔احکام سے متعلق قرآن میں ذکر شدہ آیات اور پیغمبر اکرمؐ کی محدود احادیث کے ذریعہ صبح قیامت تک پیش آنے والے بے شمار مسائل کا حل اور احکام کا استنباط کرنا بہت ہی دشوار اور پیچیدہ کام ہے جو عام افراد کے بس کا نہیں ہے۔کیونکہ قرآن مجید میں فقہی و شرعی احکام سے

[1] مائده ۳۔ یعنی آج میں نے تمہارا دین مکمل کردیا.

متعلق آیات کی تعداد تین سو سے زیادہ نہیں ہے۔ اسی طرح سے حلال و حرام اور فرائض سے متعلق آنحضرت کی احادیث کی تعداد چار سو سے زیادہ نہیں ہے اور ایک عام انسان اپنے محدود علم کے ذریعہ ان محدود مدارک سے مسلمانوں کے روز افزوں مسائل و مشکلات کا حل نکال نہیں سکتا ۔بلکہ اس کے لئے ایک ایسے لائق اور شائستہ شخص کی ضرورت ہے جو اپنے الٰہی اور غیبی علم کے ذریعہ ان محدود دلائل سے الٰہی احکام نکال کر امت کے حوالے کر سکتا ہو۔ساتھ ہی ساتھ ایسا شخص اپنے اس وسیع و لا محدود علم کی وجہ سے گناہ و خطا سے محفوظ بھی ہونا چاہئے تاکہ لوگ اس پر اعتماد کر سکیں اور ایسے شخص کو خدا کے علاوہ کوئی اور نہیں جانتا لہٰذا وہی اسے معین بھی فرمائے گا۔

تکمیل دین کی دوسری نوعیت:

یہاں ایک دوسری بات بھی کہی جا سکتی ہے،اور وہ یہ ہے کہ آیت اکمال جو اسلام کی تکمیل سے متعلق ہے اسلام کی بقا دوام کو بیان کر رہی ہے ۔کیونکہ یہ آیت کریمہ اسلامی محدثین کی متعدد و متواتر روایات کے مطابق غدیر کے دن حضرت علی ں کی ولایت و خلافت کے اعلان کے بعد نازل ہوئی ہے ۔اب رہی فرائض و محرمات اور دوسرے احکام سے متعلق تکمیل دین کی بات تو یہ اس آیت کے مقصد سے باہر کی چیز ہے ۔اس حصہ میں اسلام کے مسلمات کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ کہا جانا چاہئے کہ اس میں کوئی کلام نہیں ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ کی رحلت کے بعد وحی الٰہی کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور اب کوئی امین وحی کسی اسلامی حکم کو لیکر نہیں آئے گا ،بلکہ انسان کو صبح قیامت تک جن چیزوں کی ضرورت تھی وہ سب جبرئیل امین رسول خدا ﷺ کے پاس لا چکے ۔

دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کے تمام ہونے تک اسلامی معاشرہ کو پیش آنے والے مسائل کا حکم بیان کرنے کے لئے فقہی دلائل ہمارے پاس کافی نہیں ہیں بلکہ بہت سے احکام قرآن و حدیث میں بیان ہی نہیں کئے گئے ہیں۔ان دو باتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ تمام الٰہی احکام خود پیغمبر اکرمؐ کے زمانہ میں آچکے تھے اور آپؐ کو ان کی تعلیم دی جا چکی تھی ۔اب چوں کہ رسالت کی مدت بہت ہی مختصر تھی،ساتھ ہی ہر روز کے مسائل اور دشواریاں،نتیجہ میں آپ ان تمام احکام کی تبلیغ کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے لہٰذا آپؐ نے وہ تمام تعلیمات الٰہی اور جو کچھ بھی آپؐ نے وحی کے ذریعہ الٰہی احکام اور اسلامی اصول و فروع کی شکل میں حاصل کیا تھا سب

کچھ اپنے اس وصی و جانشین کے حوالے کردیا اور اسے سکھا دیا ،جو خود آنحضرتؐ کی طرح خطا و غلطی سے بری اور محفوظ تھا ۔تاکہ وہ آپؐ کے بعد یہ تعلیمات اور احکام رفتہ رفتہ امت کو بتائے ۔ظاہر ہے کہ ایسے شخص کی شناخت جو اس قدر وسیع علم رکھتا ہو اور ہر طرح کی خطا و لغزش سے پاک ہو صرف پیغمبر اکرم ﷺ کے تعارف اور اللہ کی جانب سے نصب و تعیین کے ذریعہ ہی ممکن ہے ۔امت انتخابات کے ذریعہ ایسے کسی شخص کو نہیں پہچان سکتی۔یہ بھی عرض کردوں کہ ہم جو یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر اکرم ﷺ جو کچھ امت سے بیان نہ کر سکے وہ انھوں نے اپنے وصی و جانشین کو تعلیم دے دیا تو اس سے مراد وہ معمولی تعلیم نہیں ہے جو ایک شاگرد اپنے استاد سے چند برسوں میں حاصل کرتا ہے کیوں کہ اگر ایسا ہوتا تو پیغمبر اکرم ﷺ ایک شخص کو اس طرح کی تربیت دینے کے بجائے ایک گروہ یا بہت سے لوگوں کی تعلیم و تربیت فرماتے ۔جب کہ یہ تعلیم ایک غیر معمولی تعلیم تھی جس میں آنحضرتؐ نے اپنے وصی کی روح و قلب پر تصرف فرما کر تھوڑی ہی دیر میں اسلام کے تمام حقائق و تعلیمات سے انھیں آگاہ کر دیا اور کوئی چیز پیغمبر ﷺ کے جانشین سے مخفی و پوشیدہ نہیں رہ گئی ۔

آخر میں یہ یاد دہانی بھی کرادوں کہ جب اسلام دنیا کے مختلف علاقوں میں پھیلا تو مسلمان نئے نئے حالات سے دو چار ہوئے جن سے پیغمبر اسلام ﷺ کے عہد میں سابقہ نہیں پڑا تھا اور آنحضرتؐ نے ان نئے حالات اور حادثات کے سلسلہ میں کوئی بات نہیں بتائی تھی۔قرآن وحدیث کے اصول وکلیات سے اس طرح کے نئے حالات و مسائل کا حکم کشف کرنا اور نکالنا بہت ہی پیچیدہ اور اختلاف انگیز ہے ۔اس سلسلہ میں تکمیل شریعت کا تقاضا یہ ہے کہ خاندان وحی سے وابستہ کوئی فرد ان نئے مسائل کا حکم قرآن و حدیث سے استنباط کرے یا ان کا حکم اس وہبی علم کے ذریعہ بیان کرے جو آنحضرتؐ نے اس کے حوالے کیا ہے۔اہل سنت معاشرہ کی ایک مشکل یہ بھی ہے کہ احکام سے متعلق قرآن کریم کی محدود آیات اور پیغمبر اکرم ﷺ کی چار سو حدیثوں سے ہی اسلام کے تمام احکام کا استنباط و استخراج کرنا چاہتے ہیں لیکن چونکہ بہت سے مواقع پر ناتوانی کا احساس کرتے ہیں اور مذکورہ بالا دلیلوں کو کافی نہیں پاتے لہٰذا قیاس و استحسان جن کی کوئی محکم اساس و بنیاد نہیں ہے،کا سہارا لے کر امت کی ضرورتوں کا حل تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ وہ خود جانتے

ہیں کہ ایک مورد کا دوسرے مورد پر قیاس یا فقہی استحسان کے ذریعہ کسی مسئلہ کا حکم بیان کرنا کوئی صحیح بنیاد نہیں رکھتا ۔ لیکن اگر امت میں کوئی ایسا شائستہ ولائق شخص ہو جو اپنے وسیع علم کے ساتھ اس قسم کے مسائل کا حکم ایک خاص طریقہ سے پیغمبر اکرم ﷺ سے حاصل کرکے امت کے حوالے کرے اور گمان و شک پر عمل کی اس بے سرو سامانی کا خاتمہ کردے تو یہ روش شریعت کی تکمیل اور لوگوں کے حقیقت تک پہنچنے کی راہ میں زیادہ مؤثر ثابت ہوگی ۔ پھر بھی گنتی کے چند نادر موارد میں قیاس و استحسان کی ضرورت پیش آئی تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان جزئی موارد میں اسلام نے آسانی کے لئے ان پر عمل کرنے کی اجازت دے دی ہے ۔ لیکن اگر شریعت کے پورے پیکر کو ظن و گمان پر استوار کریں اور ایسے قوانین دنیا کے حوالے کریں جن کی بنیاد حدس و گمان اور استحسان اور ایک مورد کا دوسرے مورد پر قیاس ہو تو ایسی صورت میں ہم نے ایسے اسلامی احکام اور اسلام کا ایسا حقوقی و جزائی مکتب فکر اور اخلاقی نظام دنیا کے سامنے پیش کیا ہے جس کی اساس و بنیاد ہی ناہموار اور پھس پھسی ہے کیا ایسی صورت میں ہم یہ توقع رکھ سکتے ہیں کہ دنیا کے لوگ ایسے اسلام کے حقوقی و جزائی احکام پر عمل کریں گے جس کے بیشتر احکام وحی الٰہی سے دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتے ۔

خلفاء امت کی لا علمی:

تاریخ اسلامی امت کے حکام و خلفاء کی اسلامی اصول و فروع سے لا علمی کے بہت سے واقعات اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے ۔ علمی محاسبات یہ تقاضا کرتے ہیں کہ امت کے درمیان ایک عالم وآگاہ امام و پیشوا کا وجود ضروری ہے جو اسلامی احکام کا محافظ اور ان کا خزانہ دار ہو اور مستقل الٰہی تعلیمات کو لوگوں تک پہنچاتا رہے ۔ ہم یہاں پر خلفا کی لاعلمی اور اسلام کے بنیادی احکام سے ان کی جہالت کے چند نمونے پیش کرتے ہیں:

۱ ۔ حضرت عمر نے اصحاب کے مجمع میں ایک شوہر دار حاملہ عورت کو جو زنا کی مرتکب ہوئی تھی سنگسار کرنے کا حکم دیا لیکن آخر کار حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کی راہنمائی کے ذریعہ یہ حکم تبدیل کیا گیا ۔ کیونکہ اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ ماں نے گناہ کیا ہے تو وہ قصور وار ہے لیکن بچہ نے کیا قصور کیا ہے جو ابھی اس کے رحم میں ہے؟

۲۔خلیفہ نے ایک ایسے شادی شدہ شوہر کو جس کی بیوی دوسرے شہر میں رہتی تھی زنا کے جرم میں سنگسار کرنے کا حکم دیا ۔جبکہ ایسے شخص کے لئے جس کی بیوی اس سے دور ہو اللہ کا حکم سو تازیانہ (کوڑے) کی سزا ہے ،سنگسار نہیں ہے ۔چنانچہ یہ حکم بھی حضرت علی علیہ السلام کے ذریعہ تبدیل کیا گیا ۔

۳۔پانچ بدکار مردوں کو خلیفہ کے پاس لایا گیا اور گواہی دی گئی کہ یہ لوگ زنا کے مرتکب ہوئے ہیں ۔ خلیفہ نے حکم دیا کے سب کو ایک طرف سے سو سو کوڑے لگائے جائیں۔امام علی علیہ السلام اس جگہ موجود تھے آپ نے فرمایا :ان میں سے ہر ایک کی سزا جدا جدا ہے۔ایک کافر ذمی ہے،اس نے اپنے شرائط پر عمل نہیں کیا ہے۔وہ قتل کیا جائے گا۔دوسرا شادی شدہ مرد ہے جسے سنگسار کیا جائے گا ۔ تیسرا جوان آزاد ہے اور غیر شادی شدہ ہے، اسے سو کوڑے لگائے جائیں گے ۔ چوتھا غیر شادی شدہ غلام ہے ،اسے آزاد کی آدھی سزا یعنی پچاس کوڑے لگائے جائیں گے،اور پانچواں شخص دیوانہ ہے،اسے چھوڑ دیا جائے گا ۔

۴۔ حضرت ابوبکر کے زمانہ میں ایک مسلمان نے شراب پی لی تھی لیکن اس کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ ایسے لوگوں میں زندگی بسر کرتا رہا ہے جو سب کے سب شراب پیتے تھے اور وہ نہیں جانتا تھا کہ اسلام میں شراب پینا حرام ہے ۔ خلیفہ اور ان کے وزیر حضرت عمر نے ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھا اور اس مشکل کو حل کرنے میں ناکام رہے آخرکار مجبور ہوکر انھوں نے حضرت علی علیہ السلام سے رجوع کیا ۔ آپ نے فرمایا : اس شخص کو مہاجرین و انصار کے مجمع میں پھراؤاگر ان میں سے کسی ایک شخص نے بھی یہ کہہ دیا کہ اس نے تحریم شراب کی آیت اسے سنائی ہے تو اس پر حجت تمام ہے اور اس پر حد جاری ہوگی ورنہ اسے معذور سمجھ کر چھوڑ دیا جائے گا ۔

۵ ۔ایک شادی شدہ عورت کو زنا کے جرم میں گرفتار کیا گیا اور اسے سنگسار کرنے کا حکم صادر کیا گیا ۔امام علی علیہ السلام نے فرمایا :اس عورت سے مزید تحقیق کی جائے،شاید اس کے پاس اس جرم کا کوئی عذر موجود ہو۔ عورت کو دوبارہ عدالت میں پیش کیا گیا ۔اس نے اس جرم کے ارتکاب کی وجہ یوں بیان کی کہ میں اپنے شوہر کے اونٹوں کو چرانے صحرا لے گئی تھی ۔ اس بیابان میں مجھ پر پیاس کا غلبہ ہوا میں نے وہاں موجود شخص سے بہت منت سماجت کی اور اس سے پانی مانگا لیکن وہ ہر بار یہ کہتا تھا کہ تم میرے آگے تسلیم ہوجاؤتو میں

تمہیں پانی دوں گا ۔جب میں نے محوس کیا کہ پیاس سے مرجاؤں گی تو میں مجبوراًاس کی شیطانی ہوس کے آگے تسلیم ہوگئی۔ اس وقت حضرت علی ں نے تکبیر بلند کی اور فرمایا: ''اللہ اکبر فمن الضطر غیر باغ و لا عاد فلا اثم علیہ ''یعنی اگر کوئی اضطرار اور مجبوری کی حالت میں کوئی غلط کام کرے تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔

اس طرح کے واقعات خلفاء کی تاریخ میں اس قدر زیادہ ہیں کہ ان پر ایک مستقل کتاب لکھی جا سکتی ہے ۔ ان تمام حوادث کا حکم بیان کرنے کا ذمہ دار کون ہے ۔اس طرح کے حوادث پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں پیش نہیںآئے تھے کہ امت ان کا حکم مرکز وحی یعنی خود آنحضرتؐ سے حاصل کرلیتی۔ پھر آنحضرت کی رحلت کے بعد اس قسم کے احکام بیان کرنے والا اور الٰہی احکام کا محافظ و خزانہ دار کسے ہونا چاہئے ۔کیا یہ کہنا درست ہوگا کہ خداوند عالم نے ایسے حالات میں امت کو خود اس کے حال پر چھوڑ دیا ہے اور اپنے معنوی فیضان کو امت سے دور کرلیا ہے ۔چاہے امت کی نادانی و جہالت کی وجہ سے لوگوں کی ناموس خطرے میں پڑجائے اور احکام حق کی جگہ باطل احکام لے لیں.[1]علامہ امینیؒ نے اپنی گرانقدر کتاب ''الغدیر''کی چھٹی،ساتویں،اور آٹھویں جلد میں خلفاء کی علمی لیاقت کے سلسلہ میں تفصیل سے گفتگو کی ہے۔

شائقین مزید معلومات کے لئے اس کتاب کی طرف رجوع کریں۔اس میں کوئی کلام نہیں ہے کہ امت کی رہبری کا مسئلہ مسلمان معاشرہ کے لئے اساسی اور حیاتی حیثیت رکھتا ہے۔چنانچہ اسی مسئلہ پر اختلاف پیدا ہوا اور اس نے امت کو دو حصوں میں تقسیم کرکے ان کے درمیان گہرا اختلاف پیدا کردیا ۔اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمام چیزوں کے بارے میں واجب، مستحب،حرام و مکروہ سے متعلق تو ساری باتیں بیان فرمائیں لیکن امت کی قیادت و رہبری اور حاکم کے خصوصیات سے متعلق کوئی بات کیوں بیان نہیں کی؟کیا انسان یہ سوچ سکتا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اتنے اہم موضوع پر کوئی توجہ نہ دی ہوگی بلکہ خاموشی اختیار کی ہوگی اور امت کو بیدار نہ کیا ہوگا؟!علمائے اہل سنت فرماتے ہیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قیادت وامامت کے طریقہ کے سلسلہ میں نفیاً و اثباتاً کوئی بات

[1] اسلام کے فروعی احکام سے متعلق امت کے حکام اور خلفاء کی لاعلمی کی ان رودادوں کی وضاحت کی ہمیں ضرورت نہیں ہے ان قضیوں کی تشریح تاریخ حدیث اور تفسیر کی کتابوں میں موجود ہے۔

نہیں بیان کی اور یہ واضح نہیں کیا کہ قیادت و رہبری کا مسئلہ انتخابی ہے یا تعیینی ہے۔ سچ مچ کیا عقل باور کرتی ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس انتہائی اہم اور حیاتی مسئلہ پر خاموشی اختیار کی ہوگی اور قضیہ کے ان دونوں پہلوں سے متعلق کوئی اشارہ نہ کیا ہوگا؟ عقل کے فیصلہ سے آگے بڑھ کر تاریخ اسلام کا جائزہ بھی اس نظریہ کے خلاف گواہی دیتا ہے ۔ اور یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مختلف موقعوں پر یہ یاد دہانی کی ہے کہ میرے بعد امت کی قیادت و رہبری کا مسئلہ خدا سے مربوط ہے اور وہ اس سلسلہ میں کوئی اختیار نہیں رکھتے ۔

یہاں ہم تاریخ اسلام سے چند نمونے پیش کرتے ہیں: جب مشرکوں کے ایک قبیلہ کے سردار ''اخنس'' نے اس شرط پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حمایت کا اظہار کیا کہ اپنے کے بعد امت کی قیادت و سرپرستی آپ ہمارے حوالے کر جائیں گے تو پیغمبر اسلامؐ نے اسے جواب دیا کہ ''الا مر الیٰ اللہ یضعہ حیث یشاء'' یعنی امت کی قیادت کا مسئلہ خدا سے مربوط ہے وہ جسے بہتر سمجھے اس امر کے لئے منتخب کرے گا ۔

قبیلہ کا سردار یہ بات سن کر مایوس ہو گیا اور اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جواب میں کہلایا کہ یہ بات بالکل درست نہیں ہے کہ رنج و زحمت میں اٹھاؤں اور قیادت و رہبری کسی اور کو ملے![1] تاریخ اسلام میں یہ واقعہ بھی ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ''یمامہ'' کے حاکم کو خط لکھ کر اسے اسلام کی دعوت دی اس نے بھی ''اخنس'' کے مانند آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آپؐ کی جانشینی کا تقاضا کیا تو آنحضرتؐ نے اسے انکار میں جواب دیتے ہوئے فرمایا: ''لا ولاکرامۃ'' یعنی یہ کام عزت نفس اور روح کی بلندی سے بعید ہے۔[2] امت کی قیادت و رہبری کا مسئلہ اتنا اہم ہے کہ اس کی اہمیت کو صرف ہم ہی نے محسوس نہیں کیا ہے بلکہ صدر اسلام میں بھی یہ مسئلہ بہت سے لوگوں کی نظر میں بڑی اہمیت رکھتا تھا ۔ مثلا جس وقت خلیفہ دومؔ ابو لؤلؤ کی ضرب سے زخمی ہوئے اور ان کے بیٹے عبد اللہ بن عمر نے اپنے باپ کو مرتے ہوئے دیکھا تو اپنے باپ سے کہا جتنی جلدی ہو سکے اپنا ایک جانشین معین کیجئے اور امت محمدیؐ کو بے حاکم و بے سر

[1] تاریخ طبری ،ج۲، ص۱۷۲
[2] تاریخ کامل، ج۲،ص۶۳

پرست نہ چھوڑئے ۔بالکل یہی پیغام ام المؤمنین عائشہ نے بھی خلیفہ دوم کو کہلایا اور ان سے درخواست کی کہ امت محمدی کے لئے ایک محافظ و نگہبان معین کر جائیں۔اب کیا یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ان دو شخصیتوں نے امت کی قیادت و رہبری کے مسئلہ کی اہمیت کو تو اچھی طرح محسوس کر لیا تھا لیکن رسول اسلام ﷺان دو افراد کے بقدر بھی اس مسئلہ کی اہمیت کو سمجھ نہیں پائے تھے ؟!پیغمبر اسلام ﷺکی مدینہ کی دس سالہ زندگی کا ایک ہلکا سا جائزہ لینے کے ساتھ ہی یہ بات پوری طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ آنحضرت جب بھی کہیں جانے کے لئے مدینہ سے نکلتے تھے کسی نہ کسی کو مدینہ میں اپنا جانشین معین کر جاتے تھے تاکہ اس مختصر سی مدت میں بھی جب پیغمبر اکرم ﷺ مدینہ میں تشریف نہیں رکھتے لوگ بے سر پرست اور بے پناہ نہ رہیں ۔ کیا یہ بہتر ہے کہ جو جانشین معین کرنے کی اہمیت سے آگاہ ہو اور یہ جانتا ہو کہ حتیٰ مختصر مدت کے لئے بھی جانشین معین کئے بغیر مدینہ کو ترک نہیں کرنا چاہئے ۔

وہ دنیا کو ترک کرے اور اپنا کوئی جانشین معین نہ کرے یا کم از کم قیادت و رہبری کی شکل ونوعیت اور حاکمیت کے طریقۂ کار کے بارے میں کچھ نہ کہے ؟!پیغمبر اسلام ﷺجب کسی علاقہ کو فتح بھی کرتے تھے تو اسے ترک کرنے سے پہلے وہاں ایک حاکم معین فرماتے تھے پھر ان حالات میں یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنا جانشین معین کرنے میں غفلت سے کام لیا ہوگا اور اس کے لئے میں کوئی فکر نہ کی ہوگی ،جو ان کے بعد امت کی قیادت و رہبری اپنے ہاتھ میں لے سکے اور اسلام کے نو پا درخت کی نگہبانی و سرپرستی کر سکے؟!

نبوت و امامت باہم ہیں:

متواترا حادیث اور اسلام کی قطعی تاریخ صاف گواہی دیتی ہیں کہ نبوت اور امامت دونوں کا اعلان ایک ہی دن ہوا اور جس روز پیغمبر اکرم ﷺخدا کی طرف سے اپنے خاندان والوں کے درمیان اپنی رسالت کا اعلان کرنے پر مامور ہوئے تھے اسی روز آپ نے اپنا خلیفہ و جانشین بھی معین فرمادیا تھا ۔اسلام کے گرانقدر مفسرین و محدثین لکھتے ہیں کہ جب آیت ''وانذر عشیرتک الاقربین''[1]نازل ہوئی تو پیغمبر

[1] شعراء ،۲۱۴

اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کو خاندان والوں کے لئے کھانا تیار کرنے کا حکم دیا جنھیں آنحضرتؐ نے مہمان بلایا تھا۔ حضرت علی علیہ السلام نے بھی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے کھانا تیار کیا اور بنی ہاشم کی پینتالیس شخصیتیں اس مجلس میں اکٹھا ہوئیں۔ پہلے روز ابو لہب کی بیہودہ باتوں کی وجہ سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی رسالت کا پیغام سنانے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ دوسرے روز پھر یہ دعوت کی گئی اور مہمانوں کے کھانا کھا لینے کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی جگہ کھڑے ہوئے اور خداوند عالم کی حمد و ثنا کرنے کے بعد فرمایا: میں تم لوگوں اور دنیا کے تمام انسانوں کے لئے خدا کا پیغامبر ہوں اور تم لوگوں کے لئے دنیا وآخرت کی بھلائی لایا ہوں۔ خدانے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تم لوگوں کو اس دین کی طرف دعوت دوں تم میں سے جو شخص اس کام میں میری امدد کرے گا وہ میرا وصی اور جانشین ہوگا۔

اس وقت حضرت علی بن ابیطالب ں کے علاوہ کسی نے بھی اٹھ کر پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نصرت و مدد کا اعلان نہیں کیا۔پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کو بیٹھ جانے کا حکم دیا اور دوبارہ اور تیسری بار بھی اپنا جملہ دہرایا اور ہر بار حضرت علی ں کے علاوہ کسی نے آپ کی حمایت اور اس راہ میں آپ کی نصرت و فداکاری کا اظہار نہیں کیا۔اس وقت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے خاندان والوں کی طرف رخ کرکے فرمایا: ''ان ھذا أخی و وصی و خلیفتی فیکم فاسمعوا و اطیعوا'' یعنی علی،میرا بھائی اور تمہارے درمیان میرا وصی و جانشین ہے،پس تم پر لازم ہے کہ اس کا فرمان سنو اور اس کی اطاعت کرو[1]۔

تاریخ کا یہ واقعہ اس قدر مسلّم ہے کہ ابن تیمیہ جس کا خاندان اہل بیتؑ سے عناد سب پر ظاہر ہے،کے علاوہ کسی نے بھی اس کی صحت سے انکار نہیں کیا ہے۔یہ حدیث حضرت علی ں کی امامت کی دلیل ہونے کے علاوہ اس بات کی سب سے اہم گواہ ہے کہ امامت کا مسئلہ امت کے اختیار میں نہیں ہے۔اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جانشین کا اعلان اس قدر اہم تھا کہ نبوت و امامت دونوں منصبوں کے مالک افراد کا اعلان ایک ہی دن پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاندان والوں کے سامنے کیا گیا ۔یہ واقعہ تین بعثت کو پیش آیا اور اس وقت تک پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت مخصوص افراد کے ذریعہ لوگوں تک پہنچائی جاتی تھی اور تقریباً ۵۰ پچاس افراد اس وقت تک مسلمان

---

[1] تاریخ طبری ج۲،ص۶۲۔۶۳. تاریخ کامل ج۲،ص۴۰۔۴۱. مسند احمد ،ج۱،ص۱۱۱ ۔

ہوئے تھے۔ اور دیگرمآخذاسلامی قوانین چاہے جتنے بھی روشن و واضح ہوں پھر بھی ان کی توضیح و تفسیر ضروری ہے بالکل یوں ہی جیسے آج ملکوں کے قوانین چاہے جس قدر روز مرہ کی زبان میں تنظیم کئے جائیں پھر بھی ان کی وضاحت کے لئے زبردست قسم کے ماہروں کی ضرورت ہوتی ہے جو ان کے اہم پہلوؤں کو واضح کر سکیں ۔ اور اسلامی قوانین بھی حتیٰ وہ بھی جو پیغمبر اکرم ﷺ کی زبان سے نقل ہوئے ہیں توضیح و تفسیر سے مستثنیٰ اور بے نیاز نہیں ہیں ۔اس کے گواہ مسلمانوں کے درمیان وہ سیکڑوں اختلافات ہیں جو قرآنی آیات اور اسلامی احادیث کے سلسلہ میں نظر آتے ہیں۔کیا اسلام کے ابدی و جاودانی قوانین کو ایسے کسی پیشوا کی ضرورت نہیں ہے جوپیغمبر اکرمؐ کے علوم کا وارث ہو اور اختلاف کے موارد میں سب کے لئے حجت ہو ؟اور کیا اختلافات دور کرنے فاصلوں کو کم کرنے اور اسلامی اتحاد بر قرار کرنے کے لئے ایسے جانشین کا تعین لازم و ضروری نہیں تھا؟

حضرت عمر کی خلافت کے دوران ایک شخص نے اسلامی عدالت میں شکایت کی کہ میری بیوی کے یہاں چھ ہی مہینہ میں بچہ پیدا ہو گیا ہے ۔ قاضی نے حکم دے دیا کہ لے جاؤ اس عورت کو سنگسار کر دو ۔راستہ میں اس عورت کی نگاہ حضرت علی علیہ السلام پر پڑی اس نے چیخ کر کہا :اے ابو الحسن میری فریاد کو پہنچئے ۔ میں ایک پاک دامن عورت ہوں اور میں نے اپنے شوہر کے علاوہ کسی سے قربت نہیں کی ہے ۔ حضرت علی علیہ السلام جب واقعہ سے آگاہ ہوئے تو انھیں یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ قاضی نے فیصلہ کرنے میں غلطی کی ہے ۔آپ نے ماموروں سے مسجد واپس چلنے کو کہا اور مسجد میں جا کر خلیفہ سے پوچھا کہ تم نے یہ کیسا فیصلہ کیا ہے ؟خلیفہ نے کہا کہ شوہر سے اس عورت کی قربت کو صرف چھ ماہ گزرے ہیں ۔ کیا کہیں چھ مہینے میں بچہ پیدا ہوتا ہے ؟ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا : کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا جس میں آیا ہے '' وحملہ و فصالہ ثلاثون شھرا[1] ''یعنی اس کا حمل اور دودھ پلانے کا زمانہ تیس ماہ ہے۔خلیفہ نے جواب دیا درست ہے ۔ پھر حضرت علی ں نے فرمایا : کیا قرآن نے دودھ پلانے کا زمانہ دو سال نہیں معین کیا ہے کہ ارشاد ہوتا ہے: '' الولدات یرضعن اولادھن حولین کاملین[2] ''یعنی مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں ۔خلیفہ نے جواب دیا :سچ فرمایا : اس پر

[1] سورہ احقاف،۱۵
[2] سورہ بقرہ ،۲۳۲

حضرت علی ں نے فرمایا : کہ اگر دودھ پلانے کے چوبیس مہینوں کو تیں مہینوں سے کم کرو تو چھ ہی ماہ باقی رہتے ہیں ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حاملگی کی کم سے کم مدت چھ ماہ ہے اور عورت اس مدت میں سالم بچہ پیدا کر سکتی ہے۔ حضرت امیر المؤمنین علی ں نے دو آیتوں کو باہم ضمیمہ کرکے ایسا قرآنی حکم استنباط کیا جس سے اصحاب واقف نہیں تھے اب کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے اس الٰہی کتاب قرآن مجید کی وضاحت کے لئے جو ایک جاوید رہنما اور ابدی قانون کی حیثیت رکھتی ہے اپنے بعد کوئی اقدام نہیں فرمایا ہے؟ ممکن ہے یہ کہا جائے کہ ایسے نادر مسئلہ میں اختلاف سے جو انسانی زندگی میں بہت کم پیش آتا ہے پورے اسلامی معاشرہ کے اتحاد کو خطرہ لاحق نہیں ہو سکتا ،تو اس کے جواب میں یہ کہا جائے گا کہ اختلاف اس طرح کے نادر مسائل سے مخصوص نہیں ہے ،بلکہ یہ اختلاف مسلمانوں کے روز مرہ اور بنیادی فرائض و وظائف سے بھی تعلق رکھتا ہے اور ظاہر ہے کہ ہر روز کے مسائل میں مسلمانوں کے اختلاف و تفرقہ سے آنکھیں بند نہیں کی جا سکتیں اور یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ اتنے سارے مسائل میں اختلافات سے مسلمانوں کے اتحاد و یکجہتی پر کوئی ضرب نہیں پڑتی ہے۔

قرآن مجید نے اپنے سورہ مائدہ آیت ۶،میں وضو کرنے کی کیفیت مسلمانوں سے بیان کی ہے اور صدر اسلام میں مسلمان ہر روز اپنی آنکھوں سے پیغمبر اسلام ﷺ کو وضو کرتے ہوئے دیکھتے تھے ، لیکن پیغمبر اسلام ﷺ کی رحلت کے بعد قرآن مجید دنیا کے دور دراز کے علاقوں میں پھیلا اور علماء کے اوپر قرآنی آیات میں اجتہاد و تفکر کا دروازہ کھلا اور فقہی احکام سے متعلق آیات پر رفتہ رفتہ بحث و تحقیق ہوئی لیکن سرانجام کیفیت وضو سے متعلق آیت کو سمجھنے میں اختلاف پیدا ہوگیا اور آج یہ اختلاف باقی اور رائج ہے کیوں کہ شیعہ علماء اپنے ہاتھوں کو اوپر سے نیچے کی طرف دھوتے ہیں اور پیروں کا مسح کرتے ہیں لیکن علمائے اہل سنت ان کے بالکل بر خلاف عمل کرتے ہیں ۔اگر امت کے درمیان ایک ایسا معصوم اور تمام اصول و فروع سے آگاہ رہبر موجود ہو کہ سب کے سب اس کی بات تسلیم اور اس کی پیروی کرتے ہوں تو ہر گز ایسا اختلاف جو مسلمانوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دے پیش نہیں آئے گا اور پورا اسلامی معاشرہ اپنے روز مرہ کے فرائض کی انجام دہی میں یک رنگ و یک شکل ہوگا ۔

قرآن کی تفسیر میں اختلاف

اسلام کے جزا و سزا کے قوانین میں ایک چور کے ہاتھ کاٹنے کا قانون ہے جو اپنے شرائط و خصوصیات کے ساتھ فقہی کتابوں میں درج ہے ابھی ابھی دو تین صدی پہلے تک جبکہ اسلام ایک طاقت کی شکل میں حاکم تھا اسلامی حکومتیں اپنے قوانین قرآن سے حاصل کرتی تھیں اور جبکہ مغربی قوانین ابھی اسلامی سرزمینوں تک نہیں پہنچے تھے چور کی تنہا سزا اس کا ہاتھ کاٹنا تھی ۔ لیکن افسوس کہ یہ ایک چھوٹا سا اور تقریبا روز مرہ کا مورد بھی ان موارد میں سے ہے کہ اسلام کی چودہ صدیاں گزرنے کے بعد بھی اس کی حد معین کرنے کے سلسلہ میں ایک نقطہ پر متحد نہیں ہو سکے۔ معتصم عباسی کے زمانہ میں جبکہ ہجرت پیغمبر اکرم ﷺ کو دو سو سال سے زیادہ گزر چکے تھے ،علماء نے اسلام کے درمیان ہاتھ کاٹنے سے متعلق آیت کی تفسیر میں اختلاف پیدا ہوگیا ۔ وہ لوگ یہ طے نہیں کر پارہے تھے کہ چور کا ہاتھ کہاں سے کاٹنا چاہئے ۔ ایک کہتا تھا :ہاتھ کلائی سے کاٹا جائے گا ۔ دوسرا کہتا تھا : ہاتھ کہنی سے کاٹا جائے گا ۔ تیسرا کہتا تھا :آخر کار خلیفۂ وقت نے شیعوں کے نویں امام حضرت امام محمد تقی علیہ السلام سے بھی دریافت کیا ۔

آپ ؑنے فرمایا : چور کے ہاتھ کی صرف چار انگلیاں کاٹی جائیں گی ۔ جب آپ ؑسے پوچھا گیا کہ اس کی دلیل کیا ہے تو آپ ؑنے فرمایاکہ خدا وند عالم قرآن مجید میں فرمایا ہے: ''و ان المساجد اللہ '' سجدہ کی جگہیں خدا کے لئے ہیں اور اس سے متعلق ہیں ۔ آپ ؑنے فرمایا : ان میں سے ایک ہتھیلی بھی ہے جسے سجدہ کے وقت زمین پر ٹکانا ضروری ہے اور جو چیز خدا سے متعلق ہو اسے کاٹا نہیں جا سکتا.
اگر امت کے درمیان ایک ایسا قرآن شناس موجود ہو جو قرآن کے اسرار و رموز سے پوری طرح آگاہی رکھتا ہو اور فکری اعتبار سے مسلمانوں کا ملجا و مرکز قرار پائے اور تمام مسلمان اس کی طرف رجوع کریں تو ظاہر ہے کہ بہت سے اختلافات آسانی سے دور ہو جائیں گے اور امت ایک ہی سمت میں ایک ہی مقصد کے ساتھ قدم بڑھائے گی۔ نہ مسلمانوں کا قیمتی وقت ضائع ہوگا اور نہ ان میں خطرناک اور خونریزاختلاف ٹکراؤ پایاجائے گا۔ قرآن مجید ہر طرح کے استنباط اور صحیح اسلام کو سمجھنے کے لئے اساسی و بنیادی ماخذ ہے اور کوئی چیز اس عظیم کتاب کی برابری نہیں کر سکتی ۔اگر دوسرے مأخذ میں باہم اختلاف نظر آئے مثلا اگر پیغمبر اکرمؐ کی دو حدیثیں باہم ٹکراؤرکھتی

ہوں تو ہم اس حدیث کو اپنائیں گے جو قرآن کے مطابق ہوگی۔ لیکن کیا دلالت اور بیان کے اعتبار سے قرآن کی تمام آئتیں ایک جیسی ہیں اور کیا قرآن میں سرے سے کوئی ایسی آیت ہے ہی نہیں جس کے لئے کسی معصوم مفسر کی ضرورت ہو ؟ یہ دعویٰ وہی کر سکتا ہے جو قرآن سے زیادہ لگاؤ نہیں رکھتا اور اس کی روح و فکر قرآن سے ہم آہنگ نہیں ہے ۔ صحیح ہے کہ قرآن کی بہت سی آیتیں دلالت کے اعتبار سے روشن و واضح ہیں اور اس کی محکم آیات میں شمار ہوتی ہیں اور وہ قرآنی آیات بھی جو مبہم ہیں دوسری آیتوں کے ذریعہ روشن و واضح ہو جاتی ہیں [1]۔ اس کے باوجود قرآن میں ایسی آیتیں موجود ہیں جو یا نزول کے وقت سے ہی مبہم ہیں یا زمانۂ وحی سے دوری کی وجہ سے مبہم ہوگئی ہیں۔ اس قسم کی آیات چاہے ان کی تعداد کم ہی کیوں نہ ہو کیسے حل کی جا سکتی ہیں؟

کیا امت کے درمیان کوئی ایسی مرکزی شخصیت موجود نہیں ہونی چاہئے جو اس قسم کی آیات کا ابہام دور کرکے ان کی صحیح تفسیر کر سکے جن میں سے بعض کے نمونے آپ اوپر ملاحظہ کر چکے ہیں؟حضرت علی علیہ السلام نے جب ابن عباس کو خوارج سے مناظرہ کے لئے روانہ کیا تو انھیں یہ حکم دیا تھا کہ : ''لاتخا صمھم بالقرآن فان القرآن حمال ذو وجوہ تقول و یقولون'' یعنی ان سے ہرگز قرآن سے بحث و مباحثہ نہ کرنا ،کیوں کہ قرآن کی آیاتیں کئی احتمالات اور کئی معانی رکھتی ہیں ۔تم ان سے بعض آیات سے استدلال کروگے اور وہ تمھیں بعض دوسری آیات سے جواب دیں گے۔یہ مسلم ہے کہ امام کی یہ گفتگو قرآن کی تمام آیات سے متعلق نہیں تھی بلکہ آپ کی گفتگو ان آیات سے متعلق تھی جو دو پہلووالی ہیں ،بظاہرروشن و واضح نہیں ہیں اور ان کا مفہوم و مفاد قطعی نہیں ہے۔اس اعتبار سے امت کے درمیان ایک امام معصوم کا وجود جو اسلام کے اصول و فروع سے پوری طرح آگاہ ہو ،قرآن کریم کے علوم پر کامل تسلط رکھتا ہو اور امت کے درمیان ایک علمی و فکری پناہگاہ ہو۔ اختلافات دور کرے اور اس کی بات فیصلہ کن ہو، لازم و ضروری ہے ورنہ دوسری صورت میں اختلافات بڑھتے جائیں گے بلکہ بعض احکام اور قرآنی آیات کی تفسیر غلط کی جائے گی جو مسلمانوں کے قرآنی حقائق سے دور ہو جانے کا باعث ہوگی۔

---

[1] حضرت امیر المومنین علی ں اس قسم کی آیات کے بارے میں فرماتے ہیں :''کتاب اللہ تبصرون بہ ،وتسمعون بہ و ینطق بعضہ ببعض و یشہد بعضہ علی بعض''

ہشام ابن حکم:

ہشام ،امام جعفر صادقں کے زبردست شاگرد اور دوسری صدی ہجری میں علم مناظرہ اور علم کلام کے استاد تھے انھوں نے امت کے درمیان اختلاف دور کرنے اور صحیح فیصلہ کے لئے امام کے وجود کی ضرورت پر روشنی ڈالی ہے کہ آپ نے ایک روز فرقہ معتزلہ کے سردار اور بصرہ کے پیشوا عمر وبن عبید سے امت کے درمیان امام معصوم کے وجود کی ضرورت پر بحث کی شروع اور اس سے درخواست کی کہ میرے سوالوں کے جواب دو ۔ عمر وبن عبید نے بھی قبول کیا ۔ ہشام نے پوچھا: تمھارے آنکھ ہے ؟ہاں اس سے کہا کام لیتے ہو ؟اس سے لوگوں اور چیزوں کو دیکھتا ہوں اور رنگوں کی تشخیص دیتا ہوں۔ تمھارے کان ہے؟ہاں؟اس سے کیا کام لیتے ہو؟اس سے آواز سنتا ہوں ۔ تمھارے ناک ہے ؟ہاں۔اس سے کیا کام لیتے ہو؟اس سے بو سونگھتا ہوں۔

اس کے بعد ہشام نے دوسرے حواس یعنی قوت ذائقہ و لامسہ اور بدن کے دوسرے اعضاء مثلا انسان کے جسم میں ہاتھ اور پاؤں وغیرہ کے بارے میں سوال کیا اور عمر وبن عبید نے ان سب کا صحیح جواب دیا ۔ پھر ہشام نے پوچھا : تمھارے دل ہے ؟ ہاں ۔انسان کے بدن میں اس کا کیا کام ہے ؟ عمرو نے جواب دیا کہ جو کچھ بدن کے تمام اعضاء و جوارح انجام دیتے ہیں قلب کے ذریعہ انھیں تشخیص دیتا ہوں ۔ اور جب بھی انسانی حواس میں سے کوئی خطا کرتا ہے یا بدن کا کوئی حصہ شک میں مبتلا ہوتا ہے تو قلب و دل کی طرف رجوع کرتا ہے اور اپنے شک کو دور کردیتا ہے ۔اس وقت ہشام نے اس بحث سے نتیجہ حاصل کرتے ہوئے کہا کہ جس خدا نے جسم کے حواس اور اعضاء کی شک و تردید دور کرنے کے لئے بدن میں ایک ایسی پناہگاہ اور مرکزی چیز پیدا کی ہے کیا یہ ممکن ہے کہ انسانی معاشرہ کو یوں ہی اس کے حال پر چھوڑ دے اور اس کے لئے کوئی پیشوا و رہبر معین نہ کرے کہ انسانی معاشرہ اپنے شک ،حیرانی اور خطا کو اس کے ذریعہ دور کرے اور صحیح راہ اختیار کر سکے[1]! امام جعفر صادق ں،جانشین پیغمبر ﷺ کے مرتبہ اور اس کی حیثیت کو یوں بیان فرماتے ہیں: پیغمبر اکرم ﷺ کی رحلت کے بعد ایسے امام کا وجود لازم و ضروری ہے جو الٰہی احکام کو ہر طرح کی گزند اور کمی و زیادتی سے

---

[1] اصول کافی ،ج۱ص۱۷۰

محفوظ رکھے اور ان کی حفاظت کرے [1]۔ ہشام ابن حکم نے ایک روز حضرت امام جعفر صادق ں کی موجودگی میں شام کے ایک عالم سے مناظرہ کیا اور اس تفصیلی مناظرہ کے دوران اس سے پوچھا کہ کیا خدا وند عالم نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد مسلمانوں کے درمیان ہر طرح کے اختلافات دور کرنے کے لئے کوئی دلیل و حجت ان کے حوالے کی ہے ؟ اس نے کہا: ہاں اور وہ دلیل و حجت قرآن کریم اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت یعنی ان کی احادیث ہیں ۔ ہشام نے پوچھا : کیا قرآن و احادیث اختلافات دور کرنے کے لئے کافی ہیں ۔اس نے جواب دیا ہاں ۔تو ہشام نے کہا اگر کافی ہیں تو پھر ہم دونوں جو ایک مذہب رکھتے ہیں اور ایک ہی درخت کی شاخیں ہیں آپس میں اختلاف کیوں رکھتے ہیں؟ اور ہم میں سے ہر ایک نے ایسی راہ کیوں اختیار کر رکھی ہے جو دوسرے کے خلاف ہے ؟! اس پر اس شامی عالم کو خاموشی اختیار کرنے اور حقانیت کا اعتراف کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نظر نہ آیا [2]۔ جس وقت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دنیا سے رحلت فرمائی تو اسلام کے اس نوجوان وجود کو باہر اور اندر سے تین طرح کے دشمن گھیرے ہوئے تھے اور ہر لمحہ اس کو خطرہ تھا کہ یہ تینوں طاقتیں باہم ایک ہو کر ایک مثلث بنائیں اور اسلام پر حملہ آور ہوں ۔

پہلا دشمن:

داخلی دشمن یعنی مدینہ اور اس کے آس پاس کے منافقین تھے جنھوں نے کئی بار پیغمبر اکرمؐ کی جان لینے کی کوشش کی تھیں اور جنگ تبوک سے واپسی کے وقت ایک خاص منصوبہ کے تحت جو پورے طورسے تاریخ میں ذکر ہوہے، پیغمبر کرمؐ کے اونٹ کو بھڑکا کر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جان لینا چاہتے تھے ۔پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان لوگوں کی سازش سے آگاہ ہو کر وہ تدبیر اپنائی کہ ان کا منصوبہ نا کام ہو گیا ۔ ساتھ ہی اسلام کی عمومی مصلحتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے آنحضرتؐ نے اپنی زندگی میں ہی ان کے نام بعض خاص افراد مثلا ''حذیفہ یمانی'' کو بتا دیئے تھے ۔اسلام کے یہ دشمن جو بظاہر مسلمانوں کے لباس میں چھپے ہوئے تھے،آنحضرت کی موت کا انتظار کر رہے تھے اور در حقیقت اس آیت کو اپنے دل میں دہرا رہے تھے جسے قرآن پیغمبرؐ کی حیات میں کافروں کی زبانی نقل کرتاہے: ''انما نتربص به

---

[1] اصول کافی ،ج۱،ص۱۷۲

[2] اصول کافی ،ج۱،ص۱۷۸

ریب المنون[1]''یعنی ہم اس کی موت کا انتظار کر رہے ہیں کہ وہ فوت ہوجائے اور اس کی شہرت ختم ہوجائے ۔ یہ لوگ یہ سوچ رہے تھے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے ساتھ ہی اسلام کی رونق ختم ہوجائے گی،اس کا پھیلاؤ رک جائے گا ۔ کچھ لوگ یہ بھی سوچتے تھے کہ اسلام آنحضرتؐ کے بعد کمزور پڑجائے گا اور وہ دوبارہ زمانۂجاہلیت کے عقائد کی طرف پلٹ جائیں گے ۔آنحضرتؐ کی رحلت کے بعد ''ابوسفیان'' نے چاہا کہ قریش اور بنی ہاشم کے درمیان اختلاف پیدا کردے اور جنگ بھڑکاکر اسلامی اتحاد کے اوپر کاری ضرب لگائے اس مقصد کے پیش نظر وہ بڑے ہمدردانہ انداز میں حضرت علی علیہ السلام کے گھر میں داخل ہوا اور ان سے بولا :اپنا ہاتھ بڑھائیے کہ میں آپ کی بیعت کروں تاکہ تمیم اور عدی قبیلوں کے لوگ آپ کی مخالفت کی جرأت نہ کریں.امام نے پوری ہوشیاری کے ساتھ صف اسلام میں اختلاف پیدا کرنے اور مسلمانوں کو آپس میں ٹکرانے کی اس کی شازش کو سمجھ لیا لہٰذا فوراً ٹکا سا جواب دیا اور خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تجہیز و تکفین میں مشغول ہوگئے[2] ۔

مسجد ضرار جو نویں ہجری میں بنائی گئی تھی اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے عمار یاسر کے ہاتھوں منہدم کی گئی تھی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات کے آخری دنوں میں منافقوں کی خفیہ سازشوں کا ایک نمونہ تھی اور دشمن خدا (ابن عامر) سے ان کے تعلقات کو ظاہر کرتی تھی ابن عامر وہ شخص ہے جوفتح ہجرت کے نویں سال جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جنگ تبوک پر جانے کے لئے مدینہ سے نکلے تو داخلی سطح پر منافقوں کے ممکنہ فساد و سازش کے خطرہ سے بہت زیادہ پریشان تھے ۔اسی لئے آپؐ نے حضرت علی علیہ السلام کو مدینہ میں اپنا جانشین مقرر کیا تھا اور آپؐ کے لئے وہ تاریخی جملہ فرمایا تھا ''انت منی بمنزلۃ ہارون من موسیٰ[3]''یعنی اے علیؑ تم کو مجھ سے وہی نسبت ہے جو ہارون کو موسیٰؑ سے تھی ۔اس کے بعد آپؐ نے ان سے تاکید کی کہ داخلی سطح پر مدینہ میں سکون و آرام برقرار رکھنے اور فتنہ و فسد کی روک تھام کے لئے مدینہ میں ہی رہو ۔منافقوں اور ان کی خطرناک سازشوں سے متعلق بہت سی آیتیں قرآن کریم کے مختلف سوروں میں موجود

---

[1] سورہ طور،۳۰

[2] الدرجات الرفیعہ ص،۷۷ حضرت علی ں نے اس موقع پر ابو سفیان سے اپنا وہ تاریخی جملہ ارشاد فرمایا: " ما زلت علی و الاسلام و اہلہ '' تو ہمیشہ اسلام اور اہل اسلام کا دشمن رہا ہے ۔ الاستیعاب ،ج،۲ص،۶۹۰
مکہ کے بعد روم بھاگ گیا اور وہاں سے اپنے گروہ کی ہدایت و رہنمائی کیا کرتا تھا.

[3] یہ حدیث شیعہ و سنی دونوں ماخذ میں تواتر کے ساتھ آئی ہے.
کہ ''منا امیر منا امیر'' یعنی یہ کہے کہ امیر ہم میں سے ہونا چاہئے اور وہ کہے کہ امیر ہم میں سے ہونا چاہئے ؟!

ہیں اور سب کی سب اسلام سے ان کی دیرینہ عداوت کو بیان کرتی ہیں ۔ اور ابھی یہ فسادی مدینہ میں موجود ہی تھے کہ آنحضرتؐ نے دنیا ے رحلت فرمائی۔ پیغمبر اسلام ﷺ کی رحلت کے بعد قبائل عرب میں ایک گروہ ایسا بھی تھا جو آپؐ کے بعد کفر و شرک کی طرف پلٹ گئے اور ماموران زکوٰۃ کو باہر نکال کر انھوں نے اسلام کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا ۔یہ لوگ اگرچہ منافق نہیں تھے، لیکن ایمان کے اعتبار سے اتنے کمزور تھے جو پت جھڑ کے پتوں کی طرح ہر رخ کی ہوا پر ادھرادھر ہی اڑنے لگتے تھے ۔اگر انھیں کفر و شرک کا ماحول مناسب لگتا تو اسلام کو چھوڑ کر کفر کی راہ اختیار کر لیتے تھے۔ایسے خونخوار دشمنوں کے ہوتے ہوئے جو اسلام کی کمین میں بیٹھے تھے اور اسلام کے خلاف سازش و شورش میں مشغول تھے کیا یہ ممکن تھا کہ ایسے عاقل، سمجھدار اور دور اندیش پیغمبر اسلام ﷺ ان ناگوار حوادث کی روک تھام کے لئے اپنا کوئی جانشین مقرر نہ کریں اور امت واسلام کو دشمنوں کے درمیان اس طرح حیران و سر گردان چھوڑ جائیں کہ ہر گروہ یہ کہتا نظر آئے

باقی دو دشمن:

اس مثلث کے بقیہ دو دشمن اس وقت کی ایران و روم کی دو بڑی طاقتیں تھیں ۔ روم کی فوج سے اسلام کی پہلی جنگ ہجرت کے آٹھویں سال فلسطین میں ہوئی جو لشکر اسلام کے بڑے بڑے سرداروں ''جعفر طیار''، ''زید بن حارث''اور ''عبداللہ بن رواحہ'' کے قتل اور لشکر اسلام کی انتہائی سخت شکست پر تمام ہوئی اور لشکر اسلام خالد بن ولید کی سرداری میں مدینہ واپس آیا ۔کفر کی فوج سے لشکر اسلام کی اتنی سخت شکست سے قیصر روم کے حوصلے بلند تھے اور ہر لمحہ یہ خطرہ تھا کہ کہیں وہ لوگ مرکز اسلام پر حملہ نہ کریں اسی وجہ سے آنحضرت ﷺ ہجرت کے نویں سال ایک بڑا لشکر جس کی تعداد تیس ہزار تھی لیکر شام کی طرف روانہ ہوئے تاکہ فوجی مشق کے علاوہ دشمن کے ممکنہ حملہ کو روک سکیں اور راہ کے بعض قبائل سے تعاون یا غیر جانبداری کا عہد وپیمان لے سکیں ۔ اس سفر میں جس میں آنحضرت ﷺ کو مسلسل رنج و زحمت اٹھانا پڑی آپؐ رومیوں سے لڑے بغیر مدینہ واپس آگئے۔اس کامیابی نے پیغمبر اکرم ﷺ کو مطمئن نہیں کیا آپؐ لشکر اسلام کی شکست کے جبران کی کوشش میں لگے رہے ۔اس کے لئے آپؐ نے اپنی بیماری سے چند روز پہلے

''اسامہ بن زید ''کو لشکر اسلام کا علم دے کر اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ اسامہ کی سرداری میں شام کی طرف روانہ ہوں اور اس سے پہلے کہ دشمن ان پر حملہ کرے وہ جنگ کے لئے تیار رہیں۔یہ تمام واقعات اس بات کی حکایت کرتے ہیں کہ پیغمبر اکرم ﷺ شمال یعنی روم کی طرف سے بہت نگراں تھے اور کہا کرتے تھے کہ ممکن ہے قیصر روم کی طرف سے اسلام کو سخت حملہ کا سامنا کرنا پڑے ۔تیسرا دشمن ایران کی ساسانی شہنشاہی تھی ۔یہاں تک کہ خسرو پرویز نے پیغمبر اکرم ﷺ کا خط پھاڑ ڈالا تھا ،سفیر کو قتل کر دیا تھا اور یمن کے گونر کو لکھا تھا کہ (معاذ اللہ) پیغمبر اکرم ﷺ کو قتل کرکے ان کا سر میرے پاس مدائن روانہ کرے ۔حجازاور یمن عرصہ سے حکومت ایران کا حصہ شمار ہوتے تھے لیکن اسلام کے آنے کے بعد حجاج نہ صرف آزاد ہو گیا تھا بلکہ خود مختار ہو گیا تھا اور یہ امکانات بھی پیدا ہو گئے تھے کہ یہ محروم اور کچلی ہوئی قوم اسلام کے سایہ میں پورے ایران پر مسلط ہو جائے۔

اگر چہ خسرو پرویز پیغمبر اکرم ﷺ کی حیات میں گزر گیا تھا لیکن ساسانیوں کی حکومت سے یمن اور حجاز کا جدا ہو جانا ان لوگوں کے لئے اتنا بڑا دھکا تھا جو خسرو کے جانشینوں کے ذہن سے دور نہیں ہوا تھا ۔ساتھ ہی یہ بڑھتی ہوئی نئی طاقت جو ایمان و اخلاص اور فداکاری سے آراستہ تھی ان کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ایسے طاقتور دشمنوں کے ہوتے ہوئے کیا یہ درست تھا کہ پیغمبر اکرم ﷺ اس دنیا سے چلے جائیں اور امت اسلام کے لئے اپنا کوئی فکری و سیاسی جانشین معین نہ کریں؟ ظاہر ہے کہ عقل، ضمیر اور سماجی محاسبات ہرگز اس کی اجازت نہیں دیتے کہ پیغمبر اکرم ﷺ سے اس طرح کی بھول ہوئی ہوگی ۔ اور انھوں نے ان تمام حادثات و مسائل کو نادیدہ قرار دیتے ہوئے اسلام کے گرد کوئی دفاعی حصار نہ بنایا ہوگا اور اپنے بعد کے لئے ایک آگاہ ،مدیر و مدبر اور جہاندیدہ رہبر معین نہ کیا ہوگا ۔

اس دنیا میں ہر وجود ایک مقصد کے تحت خلق ہوا ہے اور اس وجود کی غرض خلقت اور کمال اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب اس تخلیق کا مقصد پورا ہوجائے ۔ قدرت بھی موجودات کو کمال تک پہنچانے کے لئے ہر وہ وسیلہ اس کے حوالے کرتی ہے جو اسے کمال تک پہنچانے میں مؤثر ہوتا ہے ۔ اس راہ میں وہ صرف ضروری وسائل پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ ہر جزئی اور غیر ضروری وسائل بھی اسے عطا کرتی ہے ۔ خوش قسمتی سے اس بارہ میں عالم طبیعت سے متعلق علوم (NATURAL SCIENCES) نے ہمارے زمانہ میں

اپنی وسعت کے پیش نظر ہمیں ہر طرح کی مثال اور وضاحت سے بے نیاز کر دیا ہے۔اگر ہم صرف انسانی جسم میں سننے اور دیکھنے کے حیرت انگیز وسائل پر غور کریں تو ان میں سے ہر ایک یہ پکار پکار کر کہتا نظر آئے گا کہ نظام خلقت نے ہر وجود کو اس کے کمال جس کے لئے وہ خلق کیا گیا ہے تک پہنچانے پر خاص توجہ دے رکھی ہے۔اب ذرا ہم جسم کے دوسرے حصوں کے بارے میں غور کریں جن کی طرف سے زیادہ تر غفلت برتی گئی ہے اور اہمیت کے اعتبار سے اسے دوسروں پر ثانوی حیثیت دی گئی ہے ۔ امثال کے طور پر ہم انسان کے تلوؤں کی ساخت اور ان کے خاص انداز کے گڑھوں پر غور کریں ۔ان کو خدا نے اس غرض سے بنایا ہے کہ انسان کو چلنے میں آسانی ہو۔ حتیٰ جن کے پاؤں کے تلوے پیدائشی طور سے بالکل ہموار ہوں وہ آپریشن کے ذریعہ تلوؤں میں گڑھے بنواتے ہیں تاکہ آسانی سے چل سکیں۔

ہماری انگلیاں لمبائی اور موٹائی کے لحاظ سے باہم فرق رکھتی ہیں کیوں کہ اگر وہ سب یکساں ہوتیں تو انسان ان سے جو بہت سے مختلف کام کرتا ہے نہیں کر پاتا ۔ انگلیوں کے اس اختلاف ہی کی وجہ سے انسان ظریف اور باریک صنعتوں اور بہترین ہنر اور فنون کا خالق بنا ہے ۔اس کی ہتھیلیوں اور انگلیوں میں ایسے خطوط اور لائینیں ہیں جو ہر چھوٹی اور بڑی چیز کے اٹھانے یاپکڑنے میں اس کی مدد کرتی ہیں ،اور چوں کہ ہر انسان کی انگلیوں کے خطوط ایک دوسرے سے جدا ہیں لہٰذا ہر فرد کی شناخت کے لئے اس کی انگلیوں کے نشانات لئے جاتے ہیں۔یہ اور ان جیسی دوسری مثالوں سے ہم یہ نتیجہ لیتے ہیں کہ دست قدرت نے ہر طرح کے وسیلہ کو خواہ اس کے لئے ضروری ہو یا غیر ضروری جو بھی اس کے کمال کے لئے مؤثر ہے اس کے اختیار میں دیا ہے اور اس راہ میں اس کے لئے انتہائی سخاوت مندی کا مظاہرہ کیا ہے۔

اب یہ سوال پیش آتا ہے کہ جو خدا اس حد تک انسان کی سعادت و کمال کا خواہاں ہے،آخر یہ کیسے ممکن ہے وہ اس کے معنوی و روحانی کمال سے چشم پوشی کر لے؟!یہ بیان جس طرح خداوند عالم کی جانب سے انبیاء و مرسلین کی بعثت کی ضرورت کو ثابت کرتا ہے،اسی طرح تمام معارف و احکام کے اسرار سے آگاہ امام معصوم کے تعین کو بھی لازمی قرار دیتا ہے۔ کیونکہ وحی الٰہی کی جانب سے ایک ایسے امام

کا تعین اسلامی معاشرہ میں بہت سی کشمکشوں،جنگوں، نفاق اور معاشرہ کی پسماندگی کے خاتمہ کا سبب بنتا ہے اور مسلمانوں کو ایک جماعت اور ایک گروہ کی شکل میں تبدیل کردیتا ہے اور ہر طرح کے اختلاف و تفرقہ سے جو رہبر و خلیفہ کے انتخاب کا لازمہ ہے نجات دے دیتاہے ۔ نتیجہ میں مسلمانوں کو ''سقیفہ بنی ساعدہ '' اور دوسری پر اسرار شوراؤں کا سامنا نہیں کرنا پڑتا ۔ مسلمان پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد الٰہی نص (خدا کی طرف سے کی جانے والی تعیین) سے چشم پوشی کرکے یا (جیسا کہ علمائے اہل سنت تصور کرتے ہیں) اللہ کی جانب سے نص نہ ہونے کی صورت میں ۔ اس قدر اختلا ف وتفرقہ کا شکار ہوئے کہ اس کے منحوس آثار چودہ صدیوں کے بعد بھی دور نہیں ہوئے۔اور آج بھی استعماری طاقتیں جو مسلمانوں کو متحد دیکھنا نہیں چاہتیں مسلمانوں میں اختلاف برقرار رکھنے کے لئے آگ میں تیل ڈالنے کا کام کرتی رہتی ہیں۔

لیکن اگر مسلمان معاشرہ کا رہبر خدا کی جانب سے معین ہو اور مسلمان اپنے نا پختہ اور خام خیالات کو الٰہی نص و ہدایت پر مقدم نہ کریں تو مسلّم طور سے مسلمانوں کی حالت ہر زمانہ میں اس سے کہیں بہتر ہو۔اس کے علاوہ ہر طرح کے گناہ ،خطا اور اشتباہ سے محفوظ اور شریعت کے معارف و احکام کے اسرار سے آگاہ امام معصوم کا وجود انسانی معاشرہ اور افراد کی روحانی ترقی اور کمال کی راہ میں ایک بڑا قدم ہے۔ پھر کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایسے رہبر کا وجود کیا انگلیوں اور ہتھیلیوں کی لائنوں ،پیروں کے تلوؤں کی گہرائیوں اور آنکھوں کے اوپر ابرو کے جتنا بھی اہمیت نہیں رکھتا ہے؟!اس صورت میں کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ خداوند عالم نے انسان کے جسمانی کمال کے لئے تو ہر طرح کے وسائل اس کے اختیار میں دے دئیے لیکن معنوی کمال کے وسائل سے،جو اس کی روح کی ترقی میں موثر کردار ادا کرتے ہیں،اسے محروم کردیا ہے۔شیخ الرئیس ابن سینا نے کتاب ''شفا '' کی نبوت کی بحث میں مذکورہ بالا بیان سے انبیاء کی بعثت کی ضرورت کو ثابت کیا ہے[۱] ۔ لیکن جیسا کہ ہم عرض کرچکے ہیں یہ بیان جس طرح انبیاء و مرسلین کی بعثت کی ضرورت کو ثابت کرتا ہے اسی طرح ایک معصوم اور شریعت کے اسرار سے آگاہ امام کی تعیین کو بھی پوری طرح ثابت کرتا ہے ، جو انسانوں کے روحی کمال کا ذریعہ ہے۔ حریت و آزادی کا لفظ انسانوں کے کانوں میں پڑنے والا اب تک کا سب سے لطیف اور پرجوش لفظ ہے ۔ اس لفظ کا سننا ہی لوگوں

---

[۱] شفاء،الالہیات، فصل یکم از مقالہ دہم ص،۴۸۸،تحقیق آیۃ ا...حسن زادہ آملی

کے اندر کیف و نشاط ،وجد و خوشی کی لہر پیدا کر دیتا ہے ۔ ایک صحیح فکر رکھنے والے انسان کی سب سے بڑی آرزو اور تمنا قید و بند سے نجات ،استعمار سے جہاد اور آزادی کی بلند بام چوٹی کو فتح کرنا ہے ۔ آزادی سے متعلق انسان کا لگاؤ اتنازیادہ ہے کہ اس نے اس راہ میں بہت سی قربانیاں دی ہیں اور حد سے زیادہ فداکاریاں کی ہیں۔یہ درست ہے کہ انسان نے یہ بخوبی محسوس کر لیا ہے کہ اجتماعی زندگی ایک ایسے حاکم کے بغیر ممکن نہیں ہے جس کی رائے نافذ اور جس کا فیصلہ قطعی۔ لیکن ساتھ ہی وہ اس پر بھی ہرگز آمادہ نہیں ہے کہ اپنے مقدرات کسی ایسے شخص کے ہاتھ میں دے دے جس کے انتخاب کا اختیار اس کے ہاتھ میں نہ ہو ۔یہی وجہ ہے کہ خاص طور سے عصر حاضر میں معاشرہ کے حاکم و ذمہ دار کے تعین کے طریقوں میں وہ صرف اسی روش کو صحیح جانتا ہے،جس میں وہ اپنے رہبر کے انتخاب میں خود مختار اور آزاد ہو۔

جو حاکم ایک قوم کی سرنوشت کو اپنے ہاتھ میں لیتا ہے وہ خود عوام سے ابھرے اور عوام نے اسے منتخب کیا ہو ۔ ورنہ دوسری صورت میں وہ ایک فرد کی حکومت کو اصول آزاد کے خلاف اور جبر کی حاکمیت سمجھتا ہے۔اب دیکھنا یہ ہے کہ امامت کے سلسلہ میں پائے جانے والے دو نظریوں میں کون سا نظریہ ڈیموکریسی کے اصول سے زیادہ سازگار ہے،یہ کہ منصب امامت ایک انتخابی منصب ہے یعنی امام کو ''عام لوگوں کے ذریعہ یا اسلام کی اعلیٰ کمیٹی '' کے ہوتھوں چنا جانا چاہئے ۔یا یہ کہ رہبر اور جانشین پیغمبرؐ کا انتخاب عوام کے ہاتھ میں نہ ہو بلکہ وہ سو فیصدی خدا کی جانب سے منصوب ہو یعنی امام کو خدا اور پیغمبر کی جانب سے معین ہونا چاہئے ؟

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ پہلا نظریہ آزادی کے اصول سے زیادہ ہم آہنگ ہے ۔ اگر ہم رسول خدا ﷺ کی جانشینی کے منصب کو انتخابی سمجھیں تو اس صورت میں ہمیں یہ فخر کرنا چاہئے کہ لیبرلیزم اور آزادی مغرب میں پروان چڑھنے سے پہلے مشرق میں اور ایک ہزار چار سو سال پہلے قابل عمل تھی ۔ لیکن اس راہ سے ہم اس جگہ پہنچتے ہیں جہاں پہلے نظریہ پر عمل ہی نہیں ہوا ۔آج اہل سنت معاشرہ کے بعض اہل قلم شیعہ نظریہ یعنی امامت کے انتصابی ہونے کے موضوع پر تنقید کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پیغمبر اکرم ﷺ کی جانشینی کا نصبی ہونا آج کے سماجی نظریات اور آزادی کی روح سے کسی بھی طرح سازگار نہیں ہے۔جواب : شاید جو سب سے اہم اور دلچسپ منطق

امام کے انتخابی ہونے کے سلسلہ میں پیش کی جا سکتی ہے اور جسے آج کے انسانی معاشرہ کے خیالات سے قریب قرار دیا جا سکتا ہے، وہی منطق ہے جسے ہم اوپر بیان کر چکے ہیں اور جو کم و بیش بعض علمائے اہل سنت کے قلم سے بھی ظاہر ہو چکی ہے ۔اس طرز استدلال کا تفصیلی جواب اس پر منحصر ہے کہ موجودہ بحث کے تین اساسی نکتے پوری طرح واضح ہوں:

۱۔ منصب امامت کا نصبی یا منصوبی ہونا ''استبداد '' اور جبر سے بالکل جدا ہے۔

۲۔ مغرب کی جمہوری حکومتیں جو اقلیت پر اکثریت کی حکومت کی اساس پر استوار ہیں ۔ وہ ان غیر عادلانہ سیاسی نظاموں میں سے ہیں جنھیں آج کے انسانوں نے مجبوراً قبول کیا ہے۔

۳۔ اگر یہ فرض کر لیں کہ حاکم کے انتخاب کے لئے یہی روش صحیح و درست ہے تو کیا صدر اسلام میں خلفاء کے انتخاب میں اس روش پر عمل ہوا ہے؟ان تین نکتوں خاص طور سے دوسرے اور تیسرے نکتہ پر مفصل بحث کی ضرورت ہے کہ ہم اختصار کے ساتھ ان میں سے ہر ایک پر روشنی ڈالتے ہیں۔

الف) ۔امام کا منصوب کیا جانا استبداد نہیں:

استبدادی حکومتیں وہ انتہائی ظالمانہ طریقۂ حکومت ہے جن سے انسان دو چار رہا ہے ۔ استبدادی نظام جبر و تشدد کا وہ جانکاہ نظام ہے جنھیں انسانی معاشرہ زمانۂ قدیم سے جھیلتا آرہا ہے اور انسان کی معاشرتی زندگی میں اس کی مختلف شکلیں (گاؤں کا زمیندار ،تعلقدار،قبیلہ کا سردار یا مطلق العنان حاکم جو زمین کے وسیع علاقہ پر خود سرانہ حکومت کرتا ہے) نظر آتی رہی ہیں۔استبداد کی بڑی شکل یہ کہ ایک شخص داخلی سطح پر بغاوت کے ذریعہ حاکم کو معزول کر کے خود حاکم ہو جاتا ہے یا غلبہ اور دوسرے ملک کی فوجی طاقت کے ذریعہ حاکم ہو جاتا ہے اور ایسی حکومت کی بنیاد ڈالتا ہے جس میں صرف حاکم کی بات یا اس کا حکم ہی نافذ ہوتا ہے اور اپنے بعد کے حاکم کے لئے بھی اسی کا فیصلہ آخری فیصلہ ہوتا ہے ۔پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانشینی کے سلسلہ میں شیعوں کا نظریہ اس طرح کی حکومتوں سے میلوں کا فاصلہ رکھتا ہے ۔امام کے منصوبی ہونے سے شیعوں کا مقصد یہ ہے کہ امام خدا کی جانب سےجو سب کا خالق ہونے کے اعتبار سے تمام انسانوں پر اولویت

اور حاکمیت کا حق رکھتا ہے ایک سب سے زیادہ شائستہ فرد کی حیثیت سے جو ہر طرح کی جسمی و روحی آلودگی، برائی اور لغزش سے پاک ہے اور صرف اللہ کے حکم پر عمل کرتا ہے، پیغمبر اکرم صلى الله عليه وآله وسلم کے بعد مسلمانوں کا رہبر و پیشوا معین کیا جائے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ایسا شخص اپنے منصب پر فائز ہونے کے بعد ہر طرح کی خود سری و خود رائی سے دور ہوگا اور صرف پیغمبر اکرم صلى الله عليه وآله وسلم کے لائے ہوئے قوانین کی بنیاد پر انسانی معاشرہ کو چلائے گا۔ چونکہ خدا وند عالم خالق ہونے کی بنا پر فطری طور سے سب پر حکومت کا حق رکھتا ہے اور تمام قوموں نے اس کے قوانین کو جان و دل سے تسلیم کیا ہے لہٰذا امام بھی ان ہی قوانین کی بنیاد پر حاکم ہوا ہے اور معصوم ہونے کی بنا پر ہر طرح کے عمدی سہوی ظلم و ستم سے محفوظ ہے، ایسی حکومت معقول ترین حکومت ہے ۔ اس طرح کی حکومت میں اقلیت و اکثریت (یعنی اکثریت کی ڈکٹیٹر شپ) کا تصور ہی نہیں ہے ۔

اس میں صرف خدا کی رضا اور مخلوق کی مصلحت ہی پیش نظر ہوتی ہے (کوئی شخصی مرضی نہیں تھوپی جاتی اور نہ ان افراد کی خوشی مد نظر ہوتی ہے جنھوں نے اسے حاکم بنایا ہے) ۔ یہ الٰہی و آسمانی حکومت جس میں کسی بھی طرح کی خود سری اور خود خواہی نہیں ہے بھلا اس کا ان ظالم و استبدادی حکومتوں سے کیا تقابل ۔ یہ دونوں طرز حکومت ایک دوسرے سے اس قدر فاصلہ رکھتی ہیں۸ کہ ان میں کسی بھی مشترک پہلو کا تصور کیا ہی نہیں جا سکتا ۔

ب ۔ جمہوری حکومتوں کی کمزوریاں:

آج کی جمہوری حکومتوں کی کمزوریاں ایک دو نہیں ہیں کہ یہاں ان پر تفصیل سے بحث کی جائے لیکن ہم یہاں نمونہ کے طور پر ان میں سے دو اہم کمزوریوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ا۔ اس طریقۂ حکومت میں جو حاکم کسی پارٹی یا عوام کی ہاتھوں منتخب ہوتا ہے وہ ان کی رضامندی و خوشنودی حاصل کرنے کی فکر میں رہتا ہے ۔ ان کی ہدایت و رہبری کی فکر میں نہیں رہتا ۔ کسی پارٹی یا گروہ کے سیاستداں کے لئے یہ اہم نہیں ہے کہ وہ حق کا ساتھ دے، اہم یہ ہے عوام کی حمایت سے اسے ہاتھ نہ دھونا پڑے ۔ اس کام میں کبھی اس کے لئے لازم و ضروری ہو جاتا ہے کہ اپنے ذاتی اعتقادات اور حقائق سے بھی آنکھیں بند کر لے ۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کا اظہار و اقرار دنیا کے

ان عظیم سیاستدانوں نے بھی کیا جو عرصہ تک پوری دنیا کی سیاست سے کھیلتے رہے ہیں امریکہ کا ایک گزشتہ صدر جان۔ایف کنیڈی اپنی کتاب میں لکھتا ہے: کبھی سینیٹر مجبور ہوتا ہے کہ کسی اہم موضوع کے سلسلہ میں عام جلسہ میں فوراً ہی اپنی رائے اور نظریہ کا اظہار کرے ۔ اس میں شک نہیں ہے کہ وہ بھی غور وفکر کرنے کے لئے وقت چاہتا ہے تاکہ چند جملوں میں یا مختصر اصلاح کے ذریعہ شبہہ واختلاف کو بقدر امکان دور کرے ،لیکن نہ اسے غور کرنے کا موقع ملتا ہے نہ وہ خود کو لوگوں سے چھپا سکتا ہے اور نہ ہی اپنی رائے کے اظہار سے گریز کرسکتا ہے ۔بالکل ایسا لگتا ہے جیسے تمام موکل جنہوں نے اسے سنیٹر بنایا ہے اس کی طرف آنکھیں گاڑے ہوئے اس بات کے منتظر ہیں کہ اس شخص کے رائے ،جس سے اس کی سیاست کا مستقبل وابستہ ہے ،کیا ہوگی۔

ان تمام باتوں کے علاوہ اس بات کی فکر کہ سنیٹر کی مراعات اس سے سلب نہ کرلی جائیں اور کہیں وہ اس چرب و نرم مشغلہ سے محروم نہ کر دیا جائے بڑے سے بڑے سیاستداں کی نیندیں حرام کئے رکھتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ بعض سنیٹر اس نکتہ کی طرف متوجہ ہوئے بغیر آسان اور کم خطرہ راہ اختیار کرتے ہیں ۔ یعنی جب بھی ان کے ضمیر اور ان کے فیصلوں کے درمیان ٹکراؤ ہوتا ہے تو اپنی خود ساختہ منطق کے ذریعہ ضمیر کو مطمئن کر دیتے ہیں اور خود کو اپنے ووٹروں کے خیالات سے ہم آہنگ کر دیتے ہیں ایسے لوگوں کو ڈرپوک نہیں کہا جاسکتا بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنھیں رفتہ رفتہ عام لوگوں کے رجحان و خیالات کی پیروی کرنے کی عادت پڑگئی ہے اور اپنی بھلائی اسی میں دیکھتے ہیں کہ بہتی گنگا میں ہاتھ دھوئیں ۔

لیکن ان میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنے ضمیر کو کچل ڈالتے ہیں اور اپنے عمل کی توجیہ یوں کرتے ہیں ۔ لوگوں میں نفوذ کرنے کے لئے پوری سچائی کے ساتھ اپنے ضمیر کی آواز سے کانوں کو بند کر لیتے ہیں۔ ''فرینک کینٹ '' کے بقول سیاست کو خلاف اخلاق مشغلہ نہیں کہا جا سکتا بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ ''سیاست اخلاقی مشغلہ نہیں ہے''سیاسی رائٹر '' فرینک کنیٹ''لکھتا ہے ''کہ زیادہ سے زیادہ ووٹ حاصل کرنے کا مسئلہ بہت ہی اہم اور سنجیدہ ہے ۔اس کے حصول کی راہ میں بلاوجہ کے مسائل مثلا ''اخلاق'' یا ''حق و باطل'' پر کوئی توجہ نہیں کرنا چاہئے ۔''[1]اس سلسلہ میں ''مارک اشکال '' نے اپنے ایک ساتھی کو ۱۹۲۰ء کے امریکہ کے انتخابات میں بہترین نصیحت

---

[1] سیمائے شجاعان ،ص۳۳و۳۴

کی اور وہ یہ کہ ''تم عوام کو فریب دینا نہیں چاہتے۔یعنی تم نمائندہ بننے کی راہ میں اپنے ضمیر کو کچل نہیں رہے ہو بلکہ تم یہ بات سیکھو کہ ایک سیاسی آدمی کے لئے ایسے حالات پیش آتے ہیں جن میں وہ اپنے ضمیر سے چشم پوشی کرنے پر مجبور ہے۔[1]'' یہ آج کی دنیا کے جمہوری لوگوں کی زبان میں سب سے زیادہ منصفانہ باتیں ہیں۔اب آپ اس اجمال سے تفصیل کا اندازہ کرلیں۔یہ آزاد ملکوں کی حکومتوں کی حقیقت ہے۔کیا عقل و منطق اس کی اجازت دیتی ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانشین کو جسے بہت سی جہات میں ان ہی کی طرح ہونا چاہئے،اس جمہوری طریقہ پر یعنی عوام کے خیالات کے ذریعہ یا ارباب حل وعقد کی بیعت یا مہاجرین و انصار کی بیعت کے ذریعہ منتخب ہونا چاہئے؟ہرگز نہیں....کیوں کہ اس طریقہ سے منتخب ہونے والا شخص فکری طور سے مستقل مزاج نہیں ہوتا بلکہ اپنے ووٹروں کے افکار و خیالات کا ترجمان ہوتا ہے۔

ایسے افراد بہت ہی کم اور نادر ہیں جو اپنی شہرت کو ٹھوکر مارنے پر آمادہ ہو جائیں اور عمومی خیالات و رجحان کے طوفان سے نہ ڈریں اور جو بات امت کی بھلائی کے لئے ہو اسی پر عمل کریں۔ممکن ہے یہ خیال کیا جائے کہ ووٹروں کی رضا مندی کا لحاظ اسی وقت لازم ہے جب حکومت کی مدت چند سال میں محدود ہو،لیکن چونکہ امام کی رہبری دائمی ہے اور دائمی حاکم کی حیثیت رکھتی ہے جیسا کہ آج بھی بعض ملکوں میں عملی طور پر رائج ہے لہٰذا ضروری نہیں کہ خلافت کی کرسی پر بیٹھنے کے بعد امام و خلیفہ عوام کی رضامندی و خوشنودی حاصل کرنے کی فکر میں ہو۔تو جواب یہ ہے کہ یہ خیال بہت ہی خام اور بیجا ہے،کیوں کہ:اول تو:خود اس دائمی حاکمیت میں بھی عام انتخاب کرنے والوں کے خیالات و رجحان کو نادیدہ نہیں کیا جاسکتا،کیونکہ بے توجہی کی صورت میں حاکم کو انقلاب،شورش اور بغاوت کا سامنا کرنا پڑے گا۔دوسرے یہ کہ:کئی امید واروں کی موجودگی میں کسی ایک شخص کا ایک گروہ کی طرف سے منتخب کیا جانا کسی تعاون وہم خیالی کے وعدہ کے بغیر عملی نہیں ہے۔اور اس بات کو دیکھتے ہوئے اگر وہ اپنے کئے ہوئے وعدہ سے چشم پوشی کرلے تو یہ خود ایک بہت بڑی خرابی ہے کیونکہ اس صورت میں معاشرہ کے مربی نے عملا وعدہ خلافی کی ہے اور دوسروں کو بھی اس راہ پر چلنا سکھا یا ہے۔ عمر نے اپنی موت کے بعد خلیفہ کے انتخاب کے لئے جو چھ نفری کمیٹی بنائی تھی اس میں ''عبد الرحمن بن عوف'' نے جس کا جھکاؤ کمیٹی

[1] سیمائے شجاعان ،ص،۳۴

کے دوگروہوں کے درمیان فیصلہ کن تھا، حضرت علی ں سے کہا: میں آپ کی بیعت کرتا ہوں لیکن اسی شرط پر کہ آپ اللہ کی کتاب اور رسولؐ کی سنت اور شیخین کی سیرت پر عمل کریں گے، حضرت علی ں نے فرمایا: میں صرف خدا کی کتاب، رسول کی سنت اور اپنی عقل و فکر کی بنیاد پر عمل کروں گا۔ اس موقع پر عبد الرحمان بن عوف نے عثمان سے بھی اسی جملہ کا اقرار لیا اور عثمان نے عبد الرحمان کی شرط پر اپنی وفاداری کا اعلان کیا اور خلیفہ منتخب ہوگئے (اور بعد میں سب نے دیکھا کہ انہوں نے اپنی مرضی سے بنی امیہ کو لوگوں پر مسلط کردیا۔) مختصر یہ کہ اکثر لوگوں کا انتخاب کرنے والے ایسی شرطیں رکھتے ہیں جس کا ماننا ایک با ایمان اور با ضمیر شخص کے لئے بڑا ہی سخت اور ناگوار ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ حق شناس ان افراد شرطوں کو تسلیم نہیں کرتے لہذا منتخب بھی نہیں ہوتے اور ان کی جگہ غیر صالح افراد ہر طرح کی شرط قبول کر لیتے ہیں اور منتخب ہوجاتے ہیں۔

امریکہ کے صدر کے انتخاب میں آزاد سے آزاد شخص بھی عالمی صہیونزم کی مدد کو اپنے دستور العمل میں اولویت دینے پر مجبور ہوتا ہے اور ووٹ بنانے والی کمیٹیوں سے یہ وعدہ کرتا ہے کہ اگر منتخب ہوگیا تو اسرائیل کی مدد کرے گا۔ چاہے وہ یہ جانتا ہو کہ اس کا یہ عمل عدالت اور انسانیت کے اصول کے سراسر خلاف ہے۔

۲۔ مغرب کی جمہوری حکومتوں پر دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اس جمہوریت کی بازگشت ایک طرح کے ظلم و ڈکٹیٹر شپ "تعداد کی ڈکٹیٹر شپ" اور "اکثریت کا اقلیت پر استبداد و ظلم) ہے۔ کیونکہ اگر یہ فرض بھی کرلیں کہ انتخابات بالکل صحیح اور کسی چالبازی کے بغیر انجام پائے ہیں اس کے باوجود اکثریت جو صرف ایک ووٹ سے جیتی ہے اس اقلیت پر حکومت کرے گی جو صرف ایک ووٹ سے نہیں جیتی جب کہ ممکن ہے کہ بہت سے موارد میں حق اقلیت کے ساتھ ہو اس کا مطلب یہ ہے صرف ایک ووٹ کے ذریعہ ایک ملک اور قوم کے منافع و مصلحتیں ضائع ہوجائیں! اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ ۴۹ پر ۵۱ افراد کی حکومت ایک طرح کی ظالمانہ حکومت ہے جسے انسان نے مجبوری کی بنا پر اور اس سے بہتر طریقہ نہ ہونے کی صورت میں یا کسی اور راہ کی طرف توجہ دئیے بغیر، جس کی طرف اسلام نے رہنمائی کی ہے، اپنا یا ہے۔ لیکن خدا کی جانب سے پیغمبر اسلام ﷺ کے جانشین کے انتخاب میں جیسا کہ اوپر بیان ہوچکا ہے ان

تمام نا انصافیوں کا سد باب کردیا گیاہے۔ امام کو وہ منتخب کرتا ہے جس کے حق حاکمیت پر سب راسخ ایمان رکھتے ہیں اور امام ان قوانین کے مطابق حکومت کرتا ہے جسے تمام لوگ قبول کرتے۔ یہاں پر اقلیت و اکثریت کا مسئلہ ہی پیش نہیں آتا ۔ان سب باتوں کے علاوہ جمہوری نظاموں میں اکثریت کی خواہشات اور آرزوئیں قانون کی شکل اختیار کر لیتی ہیں اور ان کے ارادے قطعی فیصلوں اور محکم حکم کی صورت میں تمام لوگوں پر لاد دئیے جاتے ہیں،لیکن اسلامی قوانین کی روح،جس میں ہمیشہ انسانی معاشرہ کی مصلحتوں کو ہی شریعت کا رنگ ملتا ہے،ایسے پست نظریہ کی تائید نہیں کر سکتی۔

قرآن مجید جس نے ہمیشہ لوگوں کے افکار و خیالات کو خطا و غلطی سے آلودہ بتایا ہے اور اکثریت کے بارہ میں فرماتا ہے (واکثرھم لایعقلون) اور (واکثرھم لایشعرون)پھر وہ دین کے سب سے اہم موضوع یعنی امت کی امامت یا قیادت کے انتخاب کے سلسلہ میں معاشرہ کی اکثریت کے رجحان کو کیسے مؤثرو نافذ سمجھ سکتا ہے ؟کیا قرآن کریم نے یہ نہیں فرمایا : (وعسیٰ ان تکرھوا شیئا وھو خیر لکم وعسیٰ ان تحبوا شیئا و ھو شرّ لکم[1]) یعنی بعض اوقات تم کسی چیز کو ناپسند کرتے ہو جب کہ وہ تمھارے لئے مفید و نفع بخش ہوتی ہے اور بعض اوقات کسی چیز کو تم پسند کرتے ہو جب کہ وہ تمھارے لئے مضر و نقصان دہ ہے ۔ یہ وہ قانون ہے جو معاشرہ کی اکثریت کی نفسانی خواہشات کو صراحت کے ساتھ خطا شمار کرتا اور فرماتا ہے اکثر لوگوں کے خواہشات ایسی چیز کا تقاضا کرتے ہیں جو خطرناک اور نقصان دہ ہوتی ہے اور کبھی ایسی چیز سے نفرت کا اظہار کرتے ہیں جو سو فی صدی ان کے لئے مفید ہوتی ہے ۔

اس روشنی میں امام کے انتخاب یا تعیین کو جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد سب سے اعلیٰ دینی منصب ہے ،ناقابل اعتبار اکثریت کے حوالے نہیں کیا جاسکتا ۔ج)۔ کیا صدر اسلام میں خلیفہ کا انتخاب اکثریت نے کیا ؟بعض توجیہیں واقعہ کے گزر جانے کے بعد اسباب تراشی کرتی ہیں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک معاشرتی واقعہ بعض حالات و شرائط کے تحت وجود میں آتا ہے ۔ بعد میں آنے والے اس واقعہ کو وجود میں لانے والوں کے فیصلوں کی بنیاد اپنے حدس و گمان پر رکھتے ہیں اور اس واقعہ کے لئے بے جہت خوش بینی کی بنا پر ایسے اخلاقی ،فکری اور سماجی اسباب و علل تراشتے ہیں کہ واقعہ کو وجود میں لانے والوں کی روح کو ان کی بھی خبر نہیں ہوتی۔اتفاق سے

---

[1] سورہ بقرہ ،۲۱۶

خلفا کی حکومت کے لئے جمہوری نوعیت اور عوام پر عوام کی حکومت یا اقلیت پر اکثریت کی حکومت کی توجیہ اس کا روشن و واضح مصداق ہے در اصل صدر اسلام کے خلفاء کے انتخاب میں جو چیز وجود میں نہیں آئی وہ عوام کے ذریعہ خلفاء کا انتخاب تھا ۔کیوں کہ نہ اہل سنت کے محقق علماء خلیفہ کے انتخاب میں اس اصل کے معتقد ہیں اور نہ خلفاء کا انتخاب اس طریقہ سے انجام پایا ۔اس کے با وجود عصر حاضر کے بعض اہل قلم ان خلفاء کی خلافت کو صحیح و درست بتانے کے لئے ہمارے زمانہ کی چیز یعنی جمہوریت اور مغربی لیبرلیزم کا سہارا لیتے ہیں اور عوام پر عوام کی حکومت یا اقلیت پر اکثریت کی حکومت کی مثال پیش کرتے ہیں جب کہ اس طرح کی توجیہات واقعہ کے وجود میں آنے کے بعد عالم تخیل میں اس کی اسباب تراشی ہے اور خلافت کا ہرگز اس سے کوئی ربط نہیں رہا ہے۔

اب ہم مزید اطمینان کے لئے اس سلسلہ میں بعض قدیم علماء کے اقوال نقل کرتے ہیں:قاضی ایجی اپنی مشہور کتاب شرح مواقف میں لکھتے ہیں : امام کے انتخاب کے لئے کسی فرد کے خلافت پر اجماع یا امت کے اتفاق کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اصحاب پیغمبر ﷺ میں سے ایک یا دو شخص کی بیعت یا پیمان سے ہی اس شخص کی خلافت قانونی صورت اختیار کر لیتی ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اصحاب پیغمبر ﷺ نے دینی امور میں کمال ایمان کی وجہ سے صرف حضرت ابوبکر کی رائے کو کافی سمجھا جنھوں نے عمر کو اپنے بعد خلافت کے لئے معین کیا اور نہ صرف تمام مسلمانوں کے اتفاق رائے کو شرط نہیں جانا بلکہ خود مدینہ میں رہنے والے صحابہ کے اتفاق رائے کو بھی ضروری نہیں سمجھا[۱]۔ ''

احکام السلطانیہ ''کے مؤلف لکھتے ہیں :بعض لوگ یہ تصور کرتے ہیں خلیفہ کا انتخاب اسلامی شہروں میں رہنے والی بزرگ اسلامی شخصیتوں کی تصویب سے انجام پاتا ہے،جبکہ ابو بکر سقیفہ بنی ساعدہ میں صرف پانچ افراد کی رائے سے خلیفہ ہوئے،عمر ،ابو عبیدہ ،اسید بن حضیر ،بشر بن سعد اور سالم مولیٰ ابو حذیفہ[۲]۔اسلامی خلافت کی تاریخ گواہ ہے کہ عمر نے کی خلافت صرف حضرت ابوبکر کی تعیین کے ذریعہ قانونی ہو گئی اور حضرت عمر نے بھی خلافت کے لئے کسی شخص کے انتخاب کا اختیار چھ نفری کمیٹی کے حوالے کر دیا اور بقیہ تمام مسلمانوں کو انتخاب

[۱] شرح مواقف ،ج۳ص،۲۶۵
[۲] الاحکام السلطانیہ ،ص،۴

ہونے اور انتخاب کرنے سے محروم کر دیا ۔قاضی باقلانی لکھتے ہیں : ابوبکر کا انتخاب حضرت عمر کی کوشش اور دوسرے چار افراد کے ذریعہ انجام پایا[1]۔ حضرت امیر المؤمنین علی ں کی شہادت کے بعد خلافت بنی امیہ اور بنی عباس کے خاندانوں میں موروثی سلطنت کی شکل اختیار کر گئی ،جس کی کہانی بہت ہی دردناک ہے اور یہاں اس کے بیان کی گنجائش بھی نہیں ہے۔اس میں کسی بحث کی ضرورت نہیں کہ مشورہ کے ذریعہ بہت سی انفرادی و اجتماعی مشکلات حل ہوتی ہیں۔دو فکروں کا ٹکراو گویا بجلی کے دو مثبت و منفی تاروں کے ٹکرانے کے مانند ہے جس سے روشنی پیدا ہوتی ہے اور انسان کی زندگی کی راہ روشن ہوجاتی ہے۔مشورہ مشکلات کے حل کے لئے اس قدر اہم ہے کہ قرآن کریم پیغمبر اکرم ﷺ کو حکم دیتا ہے کہ زندگی کے مختلف امور میں مشورہ کرو ۔چنانچہ فرماتا ہے'' :وشاورھم فی الامر فاذا عزمت فتوکل علی اللہ ان اللہ یحب المتوکلین[2]''یعنی اپنے فیصلوں میں ان سے مشورہ کرو اور جب فیصلہ کرلو توخدا پر بھروسہ کرو ۔بلا شبہ خدا توکل کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے ۔

خداوند عالم ایک دوسری آیت میں صاحبان ایمان کی یوں تعریف کرتا ہے'' :والذین استجابوالربھم واقاموا الصلوٰۃوامرھم شوریٰ بینھم ومما رزقناھم ینفقون[3]''یعنی جو لوگ اپنے خدا کی آواز پر لبیک کہتے ہیں اورنماز قائم کرتے ہیں اوران کے فیصلوں اور کاموں کی بنیادان کاآپسی مشورہ ہے اور جوکچھ خدا انھیں رزق دیتا ہے اس میں سے انفاق کرتے ہیں۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ عقل اور نقل دونوں نے مشورہ کی اہمیت کو واضح کیا ہے اور کیا اچھا ہو کہ مسلمان اسلام کے اس عظیم دستور کی پیروی کریں جس میں ان کی سعادت وخوشبختی اور سماج کی ترقی پوشیدہ ہے۔پیغمبر اکرم ﷺ نہ صرف لوگوں کو یہ روش اپنانے کا حکم دیتے تھے بلکہ آپؐ نے اپنی زندگی میں خود بھی خدا کے اس فرمان پر عمل کیا ہے ۔جنگ میں جبکہ ابھی دشمن کا سامنا نہیں ہوا تھا ،بدر کے صحرا میں آگے بڑھنے اور دشمن سے مقابلہ کے سلسلہ میں آپؐ نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا اور ان سے فرمایا : ''اشیروا الیّ ایھا الناس''قریش سے جنگ کے سلسلہ میں تم لوگ اپنا نظریہ بیان کروکہ ہم لوگ آگے بڑھکر دشمن سے جنگ کریں یا یہیں سے واپس ہوجائیں ؟مہاجرین وانصار کی اہم شخصیتوں نے دو الگ الگ اور متضاد مشورے

---

[1] التمهيد ، ص ۱۷۸۔
[2] آل عمران ,۱۵۹
[3] شوریٰ ,۳۸

دیئے لیکن آخر کار پیغمبر اکرم ﷺ نے انصار کا مشورہ قبول کیا[1]۔ اُحد کی جنگ میں بڑے بوڑھے لوگ قلعہ بندی اور مدینہ میں ہی ٹھہرنے کے طرفدار تھے تاکہ برجوں اور مکانوں کی چھتوں سے دشمن پر تیر اندازی اور پتھروں کی بارش کرکے شہر کا دفاع کریں،جبکہ جوان اس بات کے طرفدار تھے کہ شہر سے باہر نکل کر جنگ کریں اور بوڑھوں کے نظریہ کو زنانہ روش سے تعبیر کرتے تھے ۔یہاں پیغمبر اسلام ﷺ نے دوسرے نظریہ کو اپنایا [2]۔جنگ خندق میں پیغمبر اسلام ﷺ نے ایک فوجی کمیٹی تشکیل دی اور مدینہ کے حساس علاقوں کے گرد خندق کھودنے کا جناب سلمان کا مشورہ قبول کیا اور اس پر عمل کیا[3] ۔ طائف کی جنگ میں لشکر کے بعض سرداروں کے مشورہ پر فوج کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا[4]۔

لیکن اس بات پر توجہ ہونی چاہئے کہ کیا صرف مشورہ اور تبادلۂ خیالات ہی مشکلات کا حل ہے یا یہ کہ پہلے عقل وفکر کے اعتبار سے بانفوذ مرکزی شخصیت جلسہ تشکیل دے اور تمام آراء کے درمیان سے ایک ایسی رائے منتخب کرے اور اس پر عمل کرے جو اس کی نظر میں بھی حقیقت سے قریب ہو۔ معمولاً مشوروں کے جلسوں میں مختلف افکار ونظریات پیش کئے جاتے ہیں اور ہر شخص اپنے نظریہ کا دفاع کرتے ہوئے دوسروں کی آراء کو ناقص بتاتا ہے ۔ایسے جلسہ میں ایک مسلم الثبوت رئیس و مرکزی شخص کا وجود ضروری ہے،جو تمام لوگوں کی رائے سنے اور ان میں سے ایک قطعی رائے منتخب کرے۔

ورنہ دوسری صورت میں مشورہ کا جلسہ کسی نتیجہ کے بغیر ہی ختم ہو جائے گا۔اتفاق سے وہ پہلی ہی آیت جو پیغمبر اسلام ﷺ کو اپنے ساتھیوں سے مشورہ کا حکم دیتی ہے مشورہ کے بعد سے یوں خطاب کرتی ہے : ''فاذا عزمت فتوکل علی اللہ '' پس جب تم فیصلہ کر لو تو خدا پر بھروسہ کرو ۔اس خطاب سے مراد یہ ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ سے یہ بات کہی جا رہی ہے کہ مشورہ کے بعد فیصلہ کرنے والی مرکزی شخصیت خود پیغمبر اکرم ﷺ کی ذات ہے لہٰذا پیغمبر ﷺ کو ہی فیصلہ کرنا اور خدا پر بھروسہ کرنا چاہئے۔ جمعیت کا پیشوا و رہبر،جس کے حکم سے مشورہ کا جلسہ تشکیل پایا ہے ممکن ہے کہ لوگوں کے درمیان کسی تیسرے نظریہ کو اپنائے جو اس کی نظر میں ''اصلح '' یعنی زیادہ

[1] سیرہ ابن ہشام ، ج۱ص۶۱۵ ،مغازی واقدی ص۴۸
[2] سیرہ ابن ہشام ، ج۲،ص۶۳ ،مغازی واقدی،ج ۱، ص۲۰۹
[3] تاریخ کامل ،ج۲ص۱۲۲
[4] مغازی واقدی ،ج۳ص۹۲۵

بہتر ہو۔ جیسا کہ پیغمبر اکرم ﷺ نے صلح حدیبیہ کے موقع پر اپنے اصحاب کے عمومی خیالات کی مخالفت کی اور مسلمانوں اور قریش کے بت پرستوں کے درمیان صلح کی قرار داد باندھی اور خود صلح یا صلح نامہ کے بعض پہلوؤں سے متعلق اپنے اصحاب کے اعتراضات پر کان نہیں دیئے اور زمانہ نے یہ بات ثابت کردی کہ پیغمبر اکرم ﷺ کا فیصلہ مسلمانوں کے حق میں مفید تھا ۔ اسلام میں مشورہ اور جمہوری حکومتوں کے مشورہ جس میں ملکی قوانین پاس کرنا پارلمینٹ اور سینٹ دونوں مجلسوں کے اختیار میں ہے اور حکومت کا صدر صرف ان دو مجلسوں کے تصویب شدہ قوانین کا اجرا کرنے والا ہے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔یہاں حکومت کا رئیس وحاکم جوخود پیغمبراکرم ﷺ ہیں،اقلیت یا اکثریت کی آراء کے مطابق عمل کرنے پر مجبور نہیں ہے ۔بلکہ آخری رائے یا آخری فیصلہ کا اظہار،چاہے وہ اہل مجلس کی رائے کے،موافق ہو یا مخالف،خود پیغمبر اکرم ﷺ کے اوپر ہے۔اور یہ پہلے عرض کیا جا چکا کہ مشورہ کے بعد قرآن کریم پیغمبر اکرم ﷺ کو حکم دیتا ہے کہ اب آپؐ خدا پر توکل کریں،فیصلہ کریں اور آگے بڑھیں۔

دوسری آیت کا مطلب بھی یہی ہے۔دوسری آیت تبادلۂ خیال کو باایمان معاشرہ کی ایک بہترین خوبی شمار کرتی ہے ۔لیکن یہ باایمان معاشرہ پیغمبر ﷺ کے زمانہ میں ہرگز ایک نافذ اور مطلق العنان رئیس سے خالی نہیں تھا اور عقل یہ کہتی ہے کہ آنحضرتؐ کی رحلت کے بعد بھی باایمان معاشرہ کو ایسی شخصیت سے خالی نہیں رہنا چاہئے ۔یہ آیت ایسے معاشروں کی طرف اشارہ کررہی ہے جنہوں نے حاکم ورہبر کے تعین کا مرحلہ طے کرلیا ہے اور اب دوسرے مسائل میں مشورہ یا تبادلۂ خیال کرتے ہیں ۔اس بیان سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ بعض علمائے اہل سنت کا ان آیات سے مشورہ کے ذریعہ خلیفہ کے انتخاب کو صحیح قرار دینا درست نہیں ہے ۔کیونکہ جیسا کہ ہم عرض کرچکے ہیں مذکورہ آیات ان معاشروں سے متعلق ہیں جن میں حاکم کے تعین کی شکل پہلے سے حل ہوچکی ہے اور مشورتی جلسے اس کے حکم سے تشکیل پاتے ہیں تاکہ مسلمان اپنے دوسرے امور میں تبادلۂخیال کریں،خاص طور سے پہلی آیت جو صاف طور سے پیغمبر ﷺ سے جو مسلمانوں کے رہبر ہیں۔خطاب کرتی ہے کہ مشورہ کے بعد فیصلہ کرلو اور اس کے مطابق عمل کرو۔اس کے علاوہ عمومی افکار وخیالات کی طرف رجوع اس سلسلہ میں ہے جس میں خداوند عالم کی طرف سے مسلمانوں کے لئے کوئی فریضہ معین نہ کیا گیا ہو۔ایسے میں

مسلمان تبادلۂخیال کے ذریعہ اپنا فریضہ معلوم کر سکتے ہیں،لیکن جس امر میں نص کے ذریعہ سب کا فریضہ معین کیا جا چکا ہے اس میں مشورہ کی ضرورت ہی نہیں ہے۔یہی وجہ ہے کہ جب ''حباب منذر'' پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے اور فوج کے مرکز کو دوسری جگہ منتقل کرنے کی درخواست کی تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب کرکے عرض کیا ''فان کان عن امر سلمنا و ان کا عن الرای فالتأخر عن حصنهم''[1] یعنی اگر اس سلسلہ میں کوئی الٰہی حکم ہے تو ہم تسلیم ہیں اور اگر ایسی بات ہے کہ ہم اس میں اپنی رائے دے سکتے ہیں تو لشکر اسلام کی مرکزی کمان کو دشمن کے قلعہ سے دور میں ہی بھلائی ہے۔

حضرت علی ں کی خلافت و جانشینی کا موضوع ایسا مسئلہ ہے جسے بہت سے نقلی دلائل نے ثابت اور واضح کردیا ہے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خدا کے حکم سے بہت سے موقعوں پر مثلاً یوم الدار ،غدیر خم،اوربیماری کے ایام میں ان کی خلافت و جانشینی کو صراحت سے بیان کردیاہے۔پھر اب مشورہ کے ذریعہ آنحضرت کی جانشینی کی تعیین کا مسئلہ حل کیا جانا ہے کیا معنی رکھتا ہے۔کیا یہ عمل نص کے مقابلہ میں اجتہاد اور خدا کے قطعی حکم یا دلیل کے مقابل اپنے نظریہ کا اظہار نہیں ہے؟قرآن مجید ایک آیت کے ضمن میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتاہے : جب پیغمبر اکرمؐ کے منہ بولے بیٹے زید نے اپنی بیوی جناب زینب کو طلاق دے دی اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خدا کے حکم سے جناب زینب سے شادی کرلی تو یہ بات مسلمانوں کو بہت بری لگی کیونکہ جاہلیت کے زمانہ میں منہ بولا بیٹا حقیقی بیٹے کی طرح سمجھا جاتا تھا اور جس طرح نسبی بیٹے کی بیوی سے شادی ناپسندیدہ اور حرام تھی اسی طرح منہ بولے بیٹے کی بیوی سے بھی شادی ناروا اور قبیح سمجھی جاتی تھی۔

مسلمانوں کو یہ توقع تھی کہ آنحضرت ہمارے نظریات کے پیرو ہوں گے اور ہمارے خیالات کا احترام کریں گے ۔جبکہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ عمل خدا وند عالم کے حکم سے اور جاہلیت کے رسم و رواج کو غلط قرار دینے کے لئے انجام دیا تھا ۔ اور ظاہر ہے کہ خدا کے حکم کے ہوتے ہوئے عام لوگوں کے افکار و خیالات کی طرف توجہ دینا کوئی معنی نہیں رکھتا ۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے مندرجہ ذیل آیت کے ذریعہ ان موارد میں اپنی مداخلت اور اپنے خیالات کے اظہار کو شدت سے محکوم کیا ہے ، جن میں اللہ کے حکم نے

---

[1] مغازی ،واخدی،ج۳ ص۹۲۵

مسلمانوں کے لئے کوئی خاص فریضہ معین کر دیا ہو ۔قرآن فرماتا ہے'': وما کان لمومن ولا مومنۃ اذا قضی اللہ و رسولہ امرا ان یکون لھم الخیرۃ من امرھم ومن یعص اللہ و رسولہ فقد ضل ضلالا مبینا[1]''یعنی جب خدا اور اس کا رسول کسی سلسلہ میں حکم دے دیں پھر کسی مومن یا مومنہ کو اپنے امور میں کوئی اختیار نہیں ہے (انھیں بہر حال خدا کے حکم کی پیروی کرنا ہوگی)اور جو شخص خدا اور اس کے رسول کے فرمان سے سرتابی کرے گا وہ کھلا ہوا گمراہ ہے''

دو سوالوں کے جواب:

دو سوال پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی ں کی بلا فصل خلافت کا اعلان غدیر خم میں کر دیا اور ان کی اطاعت و پیروی تمام مسلمانوں پر لازم و واجب قرار دے دی ۔یہاں دو سوال سامنے آتے ہیں ۔

ا(۔ جب حضرت علی ں کی جانشینی کا اعلان ایسے مخصوص دن کر دیا گیا تھا تو پھر اصحاب نے آنحضرتؐ کی رحلت کے بعد حضرت علیں کی وصایت و ولی عہدی کو اندیکھا کرتے ہوئے کسی اور کی پیروی کیوں کی ؟

۲(۔ امام علی علیہ السلام نے اپنی زندگی میں اپنی امامت کو ثابت کرنے کے لئے اس حدیث سے استدلال کیوں نہیں کیا؟

پہلے سوال کا جواب: اگرچہ اصحاب پیغمبرؐ کے ایک گروہ نے حضرت علی ں کی جانشینی کو فراموش کرتے ہوئے غدیر کے الٰہی فرمان سے چشم پوشی کرلی اور بہت سے لاتعلق و لاپرواہ لوگوں نے جن کی مثالیں ہر معاشرہ میں بہت زیادہ نظر آتی ہیں ان لوگوں کی پیروی کی ،لیکن ان کے مقابل ایسی نمایاں شخصیتیں اور اہم افراد بھی تھے جو حضرت علیں کی امامت و پیشوائی کے سلسلہ میں وفادار رہے ۔ اور انھوں نے امام علی ں کے علاوہ کسی اور کی پیروی نہیں کی ۔ یہ افراد اگر چہ تعداد میں پہلے گروہ سے کم اور اقلیت شمار ہوتے تھے،لیکن کیفیت و شخصیت کے اعتبار سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ممتاز اصحاب میں شمار ہوتے تھے جیسے :سلمان فارسی ،ابوذر غفاری ،مقداد بن اسود ، عمار یاسر ،ابی بن کعب،ابو ایوب انصاری ،خزیمہ بن ثابت ،بریدۂ اسلمی ،ابوہیثم بن التیھان،خالد بن سعید اور ایسے ہی بہت سے افراد

[1] احزاب ،۳۶

کہ تاریخ اسلام نے ان کے نام اور ان کی زندگی کے خصوصیات و نیک صفات، موجودہ خلافت پر ان کی تنقیدیں اور امیر المؤمنین علی ں سے ان کی وفاداریوں کو پوری باریکی کے ساتھ محفوظ کیا ہے۔ تاریخ اسلام نے دو سو پچاس صحابیوں کا ذکر کیا ہے کہ یہ سب کے سب امام کے وفادار تھے اور زندگی کے آخری لمحہ تک ان کے دامن سے وابستہ رہے ۔ ان میں سے بہت سے لوگوں نے امام کی محبت میں شہادت کا شرف بھی حاصل کیا[1]۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ صرف حضرت علی علیہ السلام کی وصایت و ولایت کا مسئلہ ہی نہیں ہے جس میں آنحضرتؐ کے صریح و صاف حکم کے باوجود پیغمبر اکرم ﷺ کے بعض صحابیوں نے مخالفت اور آنحضرتؐ کے حکم سے چشم پوشی کی، بلکہ تاریخ کے صفحات کی گواہی کے مطابق خود پیغمبرؐ کے زمانہ میں بھی بعض افراد نے آنحضرتؐ کے صاف حکم کو اندیکھا کیا ،اس کی مخالفت کی اور اس کے اس کتاب کے مؤلف نے بھی ''شخصیتھای اسلامی در شیعہ'' کے عنوان سے ایک کتاب تدوین کی ہے جس میں ان افراد کے حالات زندگی اور امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام سے ان کی ولایت کے مراتب دقیق مأخذ کے ساتھ بیان کئے ہیں اور یہ کتاب چند جلد وں میں شائع ہوگی۔

خلاف اپنے نظریہ کا اظہار کیا ۔دوسری لفظوں میں پیغمبر اکرم ﷺ کے بعض اصحاب جب آنحضرتؐ کے حکم کو اپنے باطنی خواہشات اور سیاسی خیالات کے مخالف نہیں پاتے تھے تو دل سے اسے قبول کر لیتے تھے ۔ لیکن اگر پیغمبر اکرم ﷺ کی تعلیمات کے کسی حصہ کو اپنے سیاسی افکار و خیالات اور اپنی جاہ پسند خواہشات کے خلاف پاتے تھے تو پیغمبر اکرم ﷺ کو اس کام کی انجام دہی سے روکنے کی کوشش کرتے تھے اور اگر پیغمبرؐ اپنی بات پر جمے رہتے تو آنحضرتؐ کے حکم سے سرتابی کی کوشش کرتے تھے یا اعتراض کرنے لگتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ خود پیغمبر اکرم ﷺ ان کی پیروی کریں۔ذیل میں ہم بعض اصحاب کی اس ناپسندیدہ روش کے چند نمونے بیان کرتے ہیں:

[1] سید علی خان مرحوم ''مدنی'' نے اپنی گرانقدر کتاب ''الدرجات الرفیعہ فی طبقات الشیعۃ الامامیۃ '' میں اصحاب پیغمبر اکرم ﷺ میں سے ایسے افراد کے نام و خصوصیات بیان کیئے ہیں جو حضرت علی علیہ السلام کے وفادار رہے ۔مرحوم شرف الدین عاملی نے بھی اپنی تالیف العقو ل المہمۃ ص،۱۷۷تاص۱۹۲ میں اپنی تحقیق کے ذریعہ ان میں مزید افراد کا اضافہ کیا ہے ۔

۱(۔ پیغمبر اکرم ﷺ نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں حکم دیا کہ میرے لئے قلم و دوات لے آؤ تاکہ میں ایک ایسی تحریر لکھ دوں جس کی روشنی میں میرے بعد میری امت کبھی گمراہ نہ ہو۔ لیکن وہاں موجود بعض افراد نے اپنی مخصوص سیاسی سوجھ بوجھ سے یہ سمجھ لیا کہ اس تحریر کا مقصد اپنے بعد کے لئے جانشین کے تعین کا تحریری اعلان ہے لہذا پیغمبر اکرم ﷺ کے صریحی حکم کی مخالفت کر بیٹھے اور لوگوں کو قلم و کاغذ لانے سے روک دیا!ابن عباس نے اپنی آنکھوں سے اشک بہاتے ہوئے کہا : مسلمانوں کی مصیبت اور بد بختی اسی روز سے شروع ہوئی جب پیغمبر اکرم ﷺ بیمار تھے اور آپ نے اس وقت قلم کا غذ لانے کا حکم دیا تاکہ ایسی چیز لکھ دیں کہ ان کے بعد امت اسلام گمراہ نہ ہو ۔ لیکن اس موقع پر بعض حاضرین نے جھگڑا اور اختلاف شروع کر دیا ۔ بعض لوگوں نے کہا : قلم ،کاغذ لے آؤ بعض نے کہا نہ لاؤ ۔ آخر کار پیغمبر نے جب یہ جھگڑا اور اختلاف دیکھا تو جو کام انجام دینا چاہتے تھے نہ کر سکے ۔[1]

۲(۔ مسلمانوں کے لشکر کے سردار ''زید بن حارثہ''رومیوں کے ساتھ ،جنگ موتہ میں قتل ہوگئے (کتاب علم)اس واقعہ کے بعد پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں ایک فوج تشکیل دی اور مہاجرین وانصار کی تمام شخصیتوں کو اس میں شرکت کا حکم دیا اور لشکر کا علم اپنے ہاتھوں سے ''اسامہ ابن زید''کے حوالے کیا ۔ناگہاں اسی روز آنحضرتؐ کو شدید بخار آیا جس نے آنحضرتؐ کو سخت مریض کر دیا ۔اس دوران پیغمبرؐ کے بعض اصحاب کی جانب سے اختلاف ،جھگڑے اور پیغمبر خداؐ کے صاف حکم سے سرتابی کا آغاز ہوا ۔بعض لوگوں نے ''اسامہ'' جیسے جوان کی سرداری پر اعتراض کرتے ہوئے اپنے غصہ کا اظہار کیا اور آنحضرتؐ سے اس کی معزولی کا مطالبہ کیا ۔ ایک گروہ جن کے لئے آنحضرتؐ کی موت قطعی ہو چکی تھی،جہاد میں جانے سے ٹال مٹول کرنے لگا کہ ایسے حساس موقع پر مدینہ سے باہر جانا اسلام اور مسلمانوں کے حق میں اچھا نہیں ۔پیغمبر اسلام ﷺ جب بھی اپنے اصحاب کی اس ٹال مٹول اور لشکر کی روانگی میں تاخیر سے آگاہ ہوتے تھے تو آپؐ کی پیشانی اور چہرہ سے غصہ کے آثار ظاہر ہونے لگتے تھے اور اصحاب کو آمادہ کرنے کے لئے دوبارہ تاکید کے ساتھ حکم دیتے تھے اور فرماتے تھے :جلد از جلد مدینہ ترک کرو اور روم کی طرف روانہ ہوجاؤ۔ لیکن اس قدر

[1] صحیح بخاری ج۱،ص۲۲

تاکیدات کے باوجود ان ہی اسباب کے پیش نظر جو اوپر بیان ہو چکے ہیں،ان افراد نے آنحضرتؐ کے صاف وصریح حکم کو ان سنا کر دیا اور اپنی ذاتی مرضی آگے پیغمبر اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی پیہم تاکیدات کو ٹھکرا دیا۔

۳(۔ پیغمبر اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے فرمان سے بعض اصحاب کی مخالفت کے یہی دو مذکورہ نمونے نہیں ہیں۔ اس قسم کے افراد نے سرزمین ''حدیبیہ'' پر بھی،جب آنحضرتؐ قریش سے صلح کی قرار داد باندھ رہے تھے، سختی کے ساتھ آنحضرت کی مخالفت کی اور ان پر اعتراض اور تنقیدیں کیں۔ پیغمبر اسلام صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی رحلت کے بعد ان لوگوں کی آنحضرتؐ کے دستورات سے مخالفت اس سے زیادہ ہے۔ کیونکہ ان ہی افراد نے بعض اسباب کے تحت نماز اور اذان کی کیفیت میں تبدیلی کر دی ''ازدواج موقت'' کی آیت کو ان دیکھا کر دیا ماہ رمضان مبارک کی شبوں کے نوافل کو جنھیں فرادیٰ پڑھنا چاہئے ایک خاص کیفیت کے ساتھ جماعت میں تبدیل کر دیا اور میراث کے احکام میں بھی تبدیلیاں کیں۔

ان میں سے ہر ایک تبدیلیوں اور تحریفوں اور آنحضرتؐ کے حکم سے ان سرتابیوں کے اسباب و علل اور اصطلاحی طور سے ''نص کے مقابلہ میں اجتہاد'' کی تشریح اس کتاب میں ممکن نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں کتاب ''المراجعات'' کے صفحات ۲۱۸۔ ۸۲ تک اور ایک دوسری کتاب ''النص و الاجتھاد'' کا مطالعہ مفید ہوگا،جو اسی موضوع سے متعلق لکھی گئی ہے۔ اصحاب پیغمبر اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی مخالفت اور شرارت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ قرآن مجید نے انھیں سخت انداز میں رسول خدا صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے دستورات سے مخالفت اور ان پر سبقت کرنے سے منع کیا چنانچہ فرماتا ہے'': فلیحذر الذین یخالفون عن امرہ ان تصیبھم فتنۃ او یصیبھم عذاب الیم[1]''یعنی جو لوگ رسول خدا صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے فرمان کی مخالفت کرتے ہیں وہ اس بات سے ڈریں کہ کہیں کسی بلا یا دردناک عذاب میں مبتلا نہ ہوں۔اور فرماتاہے'': یا أیھا الذین آمنوا لا تقدموا بین یدی اللہ و رسولہ واتقوا اللہ ان اللہ سمیع علیم[2]'' اے ایمان لانے والو!خدا اور اس کے رسول پر سبقت نہ کرو اور اللہ سے ڈرو کہ بلا شبہ اللہ سننے اور جاننے والا ہے۔جولوگ یہ اصرار کرتے تھے کہ پیغمبر اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم ان کے نظریات و خیالات کی

---

[1] نور ,۶۳
[2] حجرات ,۱

پیروی کریں خداوند عالم انھیں بھی وارننگ دیتا ہے '':واعلموا ان فیکم رسول اللہ لو یطیعکم فی کثیر من الامر لعنتم ''[1] اور جان لو کہ تمہارے درمیان رسول خداؐ جیسی شخصیت موجود ہے۔اگر بہت سے امور میں وہ تمہارے نظریات کی پیروی کریں گے تو تم زحمت میں پڑجاؤگے۔یہ حادثات اور یہ آیات اس بات کی صاف حکایت کرتی ہیں کہ اصحاب پیغمبرؐ میں ایک گروہ تھا جو آنحضرت کی مخالفت کرتا تھا اور جیسی ان کی اطاعت کرنا چاہئے اطاعت نہیں کرتا تھا ۔بلکہ یہ لوگ کوشش کرتے تھے کہ جو احکام الٰہی ان کے افکار اور سلیقہ سے سازگار نہیں تھے،ان کی پیروی نہ کریں۔حتیٰ یہ کوشش کرتے تھے کہ خود رسول خدا کو اپنے نظریات کا پیرو بنائیں۔افسوس رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد سیاسی میدان میں دوڑنے والے اور سقیفہ نیز فرمائشی شوریٰ کی تشکیل دینے والے یہی لوگ جنھوں نے غدیر خم میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صاف حکم اور نص الٰہی کو اپنی باطنی خواہشات کے مخالف پایا لہذا بہت تیزی سے اسے بھلادیا۔

دوسرے سوال کا جواب:جیسا کہ اس سوال میں در پردہ ادعا کیا گیا ہے،یہ یاد دلانا ضروری ہے کہ حضرت علی ں نے اپنی زندگی میں متعدد موقعوں پر حدیث غدیر کے ذریعہ اپنی حقانیت اور اپنی خلافت پر استدلال کیا ہے۔حضرت امیرالمومنین جب بھی موقع مناسب دیکھتے تھے مخالفوں کو حدیث غدیر یاد دلاتے تھے ۔اس طرح سے اپنی حیثیت لوگوں کے دلوں میں محکم فرماتے تھےاور حقیقت کے طالب افراد پر حق کوآشکار کردیتے تھے ۔نہ صرف حضرت امام علیؑ،بلکہ بنت رسول خداؐ حضرت فاطمہ زہراؑ اور ان کے دونوں صاحب زادوں امام حسن اور امام حسین علیہما السلام اور اسلام کی بہت سی عظیم شخصیتوں مثلاً عبداللہ بن جعفر،عمار یاسر،اصبغ بن نباتہ،قیس بن سعد، حتیٰ کچھ اموی اور عباسی خلفاء مثلاً عمر بن عبد العزیز اور مامون الرشید اور ان سے بھی بالاتر حضرتؑ کے مشہور مخالفوں مثلا عمروبن عاص اور..... نے حدیث غدیر سے احتجاج واستدلال کیاہے۔حدیث غدیر سے استدلال حضرت علیؑ کے زمانہ سے آج تک جاری ہےاور ہر زمانہ وہر صدی میں حضرتؑ کے دوست داروں نے حدیث غدیر کو حضرت کی امامت وولایت کے دلائل میں شمار کیاہے۔ہم یہاں ان احتجاجات اور استدلالوں کے صرف چند نمونے پیش کرتے ہیں:۱۔سب جانتے ہیں کہ خلیفہ دوم کے حکم سے بعد کے خلیفہ کے انتخاب کے لئے چھ رکنی کمیٹی تشکیل پائی تھی کمیٹی کے افراد کی ترکیب ایسی تھی کہ سبھی جانتے تھے کہ خلافت حضرت علیؑ تک نہیں پہنچے گی کیونکہ عمر

---

[1] الحجرات،۷

نے اس وقت کے سب سے بڑے سرمایہ دار عبدالرحمان بن عوف (جو عثمان کے قریبی رشتہ دار تھے) کو ویٹو پاور دے رکھا تھا۔ ان کا حضرت علیؑ کے مخالف گروہ سے جو رابطہ تھا اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ حضرت علیؑ کو اس حق سے محروم کر دیں گے۔ بہر حال جب خلافت عبد الرحمان بن عوف کے ذریعہ عثمان کو بخش دی گئی تو حضرت علیؑ نے شوریٰ کے اس فیصلہ کو باطل قرار دیتے ہوئے فرمایا: میں تم سے ایک ایسی بات کے ذریعہ احتجاج کرتا ہوں جس سے کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا یہاں تک کہ فرمایا: میں تم لوگوں کو تمہارے خدا کی قسم دیتا ہوں کیا تمہارے درمیان کوئی ایسا شخص ہے جس کے بارہ میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہو ''من کنت مولاہ فھذا علیّ مولاہ، اللّٰھم وال من والاہ وانصر من نصرہ لیبلغ الشاہد الغائب'' یعنی میں جس جس کا مولا ہوں یہ علیؑ بھی اس کے مولا ہیں۔ خدا یا تو اسے دوست رکھ اور اس کی مدد فرما جو علیؑ کی مدد کرے۔ حاضرین ہر بات غائب لوگوں تک پہنچائیں۔ اس موقع پر شوریٰ کے تمام ارکان نے حضرت علیؑ کی تصدیق کرتے ہوئے کہا: خدا کی قسم یہ فضیلت آپ کے علاوہ کسی اور میں نہیں پائی جاتی[1]۔ امام علیؑ کا احتجاج و استدلال اس حدیث سے صرف اسی ایک موقع پر نہیں تھا بلکہ امام نے حدیث غدیر سے دوسرے مقامات پر بھی استدلال فرمایا ہے۔

۲۔ ایک روز حضرت علی ں کوفہ میں خطبہ دے رہے تھے۔ تقریر کے دوران آپ نے مجمع سے خطاب کرکے فرمایا: میں تمہیں خدا کی قسم دیتا ہوں، جو شخص بھی غدیر خم میں موجود تھا اور جس نے اپنے کانوں سے سنا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے اپنی جانشینی کے لئے منتخب کیا ہے وہ کھڑے ہو کر گواہی دے۔ لیکن صرف وہی لوگ کھڑے ہوں جنھوں نے خود اپنے کانوں سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ بات سنی ہے۔ وہ نہ اٹھیں جنھوں نے دوسروں سے سنا ہے۔ اس وقت تیس افراد اپنی جگہ پر کھڑے ہوئے اور انہوں نے حدیث غدیر کی گواہی دی۔ یہ بات ملحوظ رکھنی چاہئے کہ جب یہ بات ہوئی تو غدیر کے واقعہ کو گزرے ہوئے پچیس سال ہو چکے تھے۔ اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بہت سے اصحاب کوفہ میں نہیں تھے یا اس سے پہلے انتقال کر چکے تھے اور کچھ لوگوں نے بعض اسباب کے تحت گواہی

[1] مناقب خوارزمی، ص،۲۱۷

دینے سے کوتاہی کی تھی۔ ''علامہ امینی'' مرحوم نے اس احتجاج و استدلال کے بہت سے حوالے اپنی گرانقدر کتاب ''الغدیر'' میں نقل کئے ہیں۔ شائقین اس کتاب کی طرف رجوع کر سکتے ہیں[1]۔

۳۔ حضرت عثمان کی خلافت کے زمانہ میں مہاجرین و انصار کی دوسو بڑی شخصیتیں مسجد نبیؐ میں جمع ہوئیں۔ ان لوگوں نے مختلف موضوعات پر گفتگو شروع کی۔ یہاں تک کہ بات قریش کے فضائل ان کے کارناموں اور ان کی ہجرت کی آئی اور قریش کا ہر خاندان اپنی نمایاں شخصیتوں کی تعریف کرنے لگا۔ جلسہ صبح سے ظہر تک چلتا رہا اور لوگ باتیں کرتے رہے حضرت امیر المومنینؑ پورے جلسہ میں صرف لوگوں کی باتیں سنتے رہے۔ اچانک مجمع آپؑ کی طرف متوجہ ہوا اور درخواست کرنے لگا کہ آپ بھی کچھ فرمائیے۔ امام علیہ السلام لوگوں کے اصرار پر اٹھے اور خاندان پیغمبر ﷺ سے اپنے رابطہ اور اپنے درخشاں ماضی سے متعلق تفصیل سے تقریر فرمائی۔ یہاں تک کہ فرمایا: کیا تم لوگوں کو یاد ہے کہ غدیر کے دن خداوند عالم نے پیغمبر اکرم ﷺ کو یہ حکم دیا تھا کہ جس طرح تم نے لوگوں کو نماز، زکات اور حج کی تعلیم دی یوں ہی لوگوں کے سامنے علیؑ کی پیشوائی کا بھی اعلان کر دو۔

اسی کام کے لئے پیغمبر ﷺ نے ایک خطبہ ارشاد فرمایا اور اس میں فرمایا: خداوند عالم نے ایک فریضہ میرے اوپر عائد کیا ہے۔ میں اس بات سے ڈرتا تھا کہ کہیں اس الٰہی پیغام کو پہنچانے میں لوگ میری تکذیب نہ کریں، لیکن خداوند عالم نے مجھے حکم دیا کہ میں یہ کام انجام دوں اور یہ خوش خبری دی کہ اللہ مجھے لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا۔ اے لوگو! تم جانتے ہو کہ خدا میرا مولا ہے اور میں مومنین کا مولا ہوں اور ان کے حق میں ان سے زیادہ اولیٰ بالتصرف ہوں؟ سب نے کہا ہاں۔ اس وقت پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا: علی! اٹھو۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ آنحضرتؐ نے مجمع کی طرف رُخ کر کے فرمایا: ''من کنت مولاہ فھذا علی مولاہ اللّٰھم وال من والاہ و عاد من عاداہ'' جس کا میں مولا ہوں اس کے یہ علیؑ مولا ہیں۔ خدایا! تو اسے دوست رکھ جو علیؑ کو دوست رکھے اور اسے دشمن رکھ جو علیؑ سے دشمنی کرے۔ اس موقع پر سلمان فارسی نے رسول خدا ﷺ سے دریافت کیا: علیؑ ہم پر کیسی ولایت رکھتے ہیں؟ پیغمبر اکرم ﷺ نے

---

[1] الغدیر، ج۱، ص۱۵۳۔۱۷۱

فرمایا: ''ولاۂ کولائی،من کنت اولی بہ من نفسہ،فعلیؑ اولی بہ من نفسہ ''یعنی تم پر علیؑ کی ولایت میری ولایت کے مانند ہے ۔ میں جس جس کی جان اور نفس پر اولویت رکھتا ہوں علیؑ بھی اس کی جان اور اس کے نفس پر اولویت رکھتے ہیں[1]۔

۴۔ صرف حضرت علی ں نے ہی حدیث غدیر سے اپنے مخالفوں کے خلاف احتجاج و استدلال نہیں کیا ہے بلکہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی پارہ جگر حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا نے ایک تاریخی دن جب آپ اپنے حق کو ثابت کرنے کے لئے مسجد میں خطبہ دے رہی تھیں، تو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اصحاب کی طرف رخ کرکے فرمایا:کیا تم لوگوں نے غدیر کے دن کو فراموش کردیا جس دن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے حضرت علیؑ کے بارے میں فرمایا تھا'' : من کنت مولاہ فھذا علی مولاہ ''جس کا میں مولا ہوں یہ علی اس کے مولا ہیں.

۵۔ جس وقت امام حسن علیہ السلام نے معاویہ سے صلح کی رار داد باندھنے کا فیصلہ کیا تو مجمع میں کھڑے ہو کر ایک خطبہ دیا اور اس میں فرمایا'' :خدا وندعالم نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اہل بیتؑ کو اسلام کے ذریعہ مکرم اور گرامی قرار دیا ہمیں منتخب کیا اور ہر طرح کی رجس وکثافت کو ہم سے دور رکھا ۔ یہاں تک کہ فرمایا: پوری امت نے سنا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے حضرت علی ں سے فرمایا: تم کو مجھ سے وہ نسبت ہے جو ہارون کو موسیٰؑ سے تھی،'' تمام لوگوں نے دیکھا اور سنا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے غدیر خم میں حضرت علیں کا ہاتھ تھام کرلوگوں سے فرمایا '' :من کنت مولاہ فعلی مولاہ اللھم وال من والاہ وعاد من حضرت علی علیہ السلام نے ان تین موقعوں کے علاوہ مسجد کوفہ میں ''یوم الرجعہ''نام کے دن،روز ''جمل'' ''حدیث الرکبان''کے واقعہ میں اور ''جنگ صفین'' میں حدیث غدیر سے اپنی امامت پر استدلال کیا ہے ۔عاداہ''[2]

٦۔ امام حسین علیہ السلام نے بھی سرزمین مکہ پر حاجیوں کے مجمع میں جس میں اصحاب پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ایک بڑی تعداد موجود تھی خطبہ دیتے ہوئے فرمایا'':میں تمھیں خدا کی قسم دیتا ہوں کیا تم جانتے ہو کہ پیغمبر اسلامؐ نے غدیر کے دن حضرت علی ں کو اپنی خلافت و ولایت کے لئے منتخب کیا اور فرمایا کہ : حاضرین یہ بات غائب لوگوں تک پہنچا دیں ''؟پورے مجمع نے کہا : ہم گواہی دیتے ہیں ۔

---

[1] فرائد السمطین،باب۵۸۔
[2] ینابیع المودۃ ص۴۸۲

۷ ۔ ان کے علاوہ جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں، پیغمبر اسلام ﷺ کے کئی اصحاب مثلاً عمار یاسر ،زید بن ارقم ،عبداللہ بن جعفر ،اصبغ بن نباتہ اور دوسرے افراد نے بھی حدیث غدیر کے ذریعہ حضرت علی ں کی خلافت و امامت پر استدلال کیا ہے[1] ۔ اس کتاب میں بائیس استدلال حوالوں کے ساتھ درج ہیں۔

قرآن و عترت کا باہم اٹوٹ رشتہ

حدیث ثقلین[2] اسلام کی ان قطعی و متواتر احادیث میں سے ہے جسے علمائے اسلام نے پیغمبر اسلام ﷺ سے نقل کیا ہے ۔ مختلف زمانوں اور صدیوں میں اس حدیث کے متعدد اور قابل اعتماد اسناد پیغمبر اسلام ﷺ کی حدیث کو قطعی ثابت کرتے ہیں اور کوئی بھی صحیح فکر اور صحیح مزاج والا شخص اس کی صحت و استواری میں شک نہیں کر سکتا ۔ علمائے اہل سنت کے نقطہ نظر سے اس حدیث کا جائزہ لینے سے پہلے ہم ان سے بعض افراد کی گواہی یہاں نقل کرتے ہیں ''؛مناوی'' کے بقول :یہ حدیث ایک سو بیس (۱۲۰) سے زیادہ صحابیوں نے پیغمبر اسلام ﷺ سے نقل کی ہے[3] ۔ اور کسر ''ث'' اور جزم ''ق'' سے مراد کوئی گرانقدر چیز .ابن حجر عسقلانی کے بقول : حدیث ثقلین بیس (۲۰) سے زیادہ طریقوں سے نقل ہوئی ہے[4] عظیم شیعہ عالم علامہ میر حامد حسین مرحوم ،جن کا انتقال سنہ ۱۳۰۶ھ میں ہوا ہے،انھوں نے مذکورہ حدیث کو علمائے اہل سنت کی ۵۰۲ کتابوں سے نقل کیا ہے ۔ حدیث کی سند اور دلالت سے متعلق ان کی تحقیق چھ جلدوں میں اصفہان سے شائع ہو چکی ہے ،شائقین اس کتاب کے ذریعہ اس حدیث کی عظمت سے آگاہ ہو سکتے ہیں۔

اگر ہم اہل سنت کے مذکورہ راویوں پر شیعہ راویوں کا اضافہ کردیں تو حدیث ثقلین معتبر اور متواتر ہونے کے اعتبار سے اعلیٰ درجہ پر نظر آتی ہے ،جس کے اعتبار کا مقابلہ حدیث غدیر کے علاوہ کسی اور حدیث سے نہیں کیا جا سکتا ۔حدیث ثقلین کا متن یہ ہے '' انی تارک فیکم الثقلین کتاب اللہ و عترتی اہل بیتی ما ان تمسکتم بھما لن تضلوا ابدا ولن یفترقا حتیٰ یردا علی الحوض'' ''،میں تمھارے درمیان دو گرانقدر

[1] مزید آگاہی کے لئے ''الغدیر '' ج۱ص۱۴۶تا ص۱۹۵ ملاحظہ فرمائیں۔
[2] ثقل ،فتح ''ق'' اور ''ث'' اس کے معنی ہیں کوئی بہت نفیس اور قیمتی امر ۔
[3] فیض القدیر ،ج۳ص۱۴
[4] صواعق محرقہ ،عسقلانی ،حدیث ۱۳۵

امانتیں چھوڑے جا رہا ہوں ،ایک اللہ کی کتاب اور دوسرے میری عترت و اہل بیتؑ ہیں ،جب تک تم ان دونوں سے متمسک رہوگے ہرگز گمراہ نہ ہوگے یہ دونوں کبھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے ،یہاں تک کہ میرے پاس حوض کوثر پہ پہنچ جائیں ''[1]البتہ یہ حدیث اس سے بھی وسیع انداز میں نقل ہوئی ہے ۔ حتی ابن حجر نے لکھا ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ نے اس حدیث کے آخر میں اضافہ فرمایا '' :ھٰذا علی من القرآن و القرآن مع علی لا یفترقان''[1] ''یعنی یہ علی ہمیشہ قرآن کے ساتھ ہیں اور قرآن علی کے ہمراہ ہے ۔یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے''

مذکورہ بالا روایت حدیث کی وہ مختصر صورت ہے جسے اسلامی محدثوں نے نقل کیا ہے اور اس کی صحت پر گواہی دی ہے ۔ لیکن حدیث کی صورت میں اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ نے مختلف موقعوں پر الگ الگ تعبیروں میں لوگوں کو قرآن و اہل بیتؑ کے اٹوٹ رشتہ سے آگاہ کیا ہے ۔ پیغمبر اکرم ﷺ نے ان دونوں حجتوں کے ربط کو حجۃ الوداع کے موقع پر غدیر خم[2] میں ۔ منبر پر[3]،اور بستر بیماری پر[4] جب کہ آپ کا حجرہ اصحاب سے بھرا ہوا تھا ،بیان کیا تھا ۔اور اجمال و تفصیل کے لحاظ سے حدیث کے اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ آنحضرت نے اسے مختلف تعبیروں سے بیان کیا ہے. اگر چہ حدیث مختلف صورتوں سے نقل ہوئی ہے اور پیغمبر اکرم ﷺ نے اپنی دو یادگاروں کو کبھی ''ثقلین''، کبھی ''خلیفتین'' اور کبھی ''امرین'' کے الفاظ سے یاد کیا ہے ،اس کے باوجود سب کا مقصد ایک ہے اور وہ ہے قرآن کریم اور پیغمبر اکرم ﷺ کی عترت و اہل بیت کے درمیان اٹوٹ رابطہ کا ذکر ۔

حدیث ثقلین کا مفاد :

حدیث ثقلین کے مفاد پر غور کرنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ کی عترت و اہل بیت گناہ تو گناہ خطا ولغزش سے بھی محفوظ و معصوم ہیں ،کیوں کہ جو چیز صبح قیامت تک قرآن کریم سے اٹوٹ رشتہ و رابطہ رکھتی ہے وہ قرآن کی ہی طرح (جسے خدا وند

---

[1] ینابیع المودۃ ص۳۲وص۴۰
[2] مستدرک ،حاکم ،ج۳ص۱۰۹ وغیرہ
[3] بحار الانوار ج۲۲ص۷۶نقل از مجالس مفید
[4] الصواعق المحرقہ ،ص۷۵

عالم نے ہر طرح کی تحریف سے محفوظ رکھا ہے) ہر خطا و لغزش سے محفوظ ہے ۔ دوسرے لفظوں میںیہ جو پیغمبر اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اسلامی امت صبح قیامت تک (جب یہ دونوں یادگاریں پیغمبر اکرم ﷺ سے ملاقات کریں گی) ان دونوں سے وابستہ رہے اور ان دونوں کی اطاعت و پیروی کرے ،اس سے یہ بات اچھی سمجھی جا سکتی ہے کہ یہ دونوں الٰہی حجتیں اور پیغمبر اکرم ﷺ کی یادگاریں ،ہمیشہ خطا و غلطی سے محفوظ اور ہر طرح کی کجی و انحراف سے دور ہیں ۔ کیوں کہ یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ خداوند عالم کسی عاصی و گناہگار انسان کی اطاعت ہم پر واجب کرے یا قرآن مجید جیسی خطا سے پاک کتاب کا کسی خطاکار گروہ سے اٹوٹ رشتہ قرار دیدے ۔قرآن کا ہمسر اور اس کے برابر تنہا وہی گروہ ہو سکتا ہے جو ہر گناہ اور ہر خطا و لغزش سے پاک ہو ۔

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں ،امامت کے لئے سب سے اہم شرط عصمت یعنی گناہ و خطا سے اس کا محفوظ رہنا ہے ۔آگے بھی ہم عقل کی روشنی میں الٰہی پیشواؤں اور رہبروں کے لئے اس کی ضرورت پر ثبوت فراہم کریں گے حدیث ثقلین بخوبی اس بات کی گواہ ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ کی عترت و اہل بیت قرآن کی طرح ہر عیب و نقص ،خطا و گناہ سے پاک ہیں اور چونکہ ان کی پیروی واجب کی گئی ہے لہٰذا انھیں بہر حال گناہ و معصیت سے پاک ہونا چاہئے ۔

امیر المؤمنینؑ کا حدیث ثقلین سے استدلال:

کتاب ''احتجاج'' کے مؤلف احمد بن علی ابن ابیطالب کتاب ''سلیم بن قیس'' سے (جو تابعین میں ہیں اور حضرت امیر المومنین کے عظیم شاگرد ہیں) نقل کرتے ہیں کہ عثمان کی خلافت کے دور میں مسجد النبیؐ میں مہاجرین و انصار کا ایک جلسہ ہوا جس میں ہر شخص اپنے فضائل و کمالات بیان کر رہا تھا ۔ اس جلسہ میں امام علیؑ بھی موجود تھے لیکن خاموش بیٹھے ہوئے سب کی باتیں سن رہے تھے ۔ آخر کار لوگوں نے امامؑ سے درخواست کی کہ آپؑ بھی اپنے بارہ میں کچھ بیان کریں ،امام نے ایک تفصیلی خطبہ ارشاد فرمایا جس میں چند آیات کی تلاوت بھی فرمائی جو آپ کے حق میں نازل ہوئی تھی اس کے ساتھ ہی آپ نے ارشاد فرمایا : میں تمھیں خدا کی قسم دیتا ہوں کیا تم جانتے ہو کہ رسول خداؐ نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں خطبہ دیا تھا اور اس میں فرمایا تھا '' یا أیھا الناس انی تارک فیکم الثقلین کتاب اللہ و عترتی

اہل بیتی فتمسکوا بھما لاتضلوا ''۔'' اے لوگو! میں تمھارے درمیان دو گرانقدر میراث چھوڑے جا رہا ہوں ۔ اللہ کی کتاب اور میرے اہل بیت،پس ان دونوں سے وابستہ رہو کہ ہر گز گمراہ نہ ہوگے[1] ۔ مسلم ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی عترت و اہل بیت،سے مراد ان سے وابستہ تمام افراد نہیں ہیں کیوں کہ امت کا اس پر اتفاق ہے کہ تمام وابستہ افراد لغزش و گناہ سے پاک و مبرا نہیں تھے بلکہ اس سے مراد وہ معین تعداد ہے جن کی امامت پر شیعہ راسخ عقیدہ رکھتے ہیں ۔ دوسرے لفظوں میں اگر ہم حدیث ثقلین کے مفاد کو قبول کر لیں تو عترت و اہل بیت کے افراد اور ان کے مصداق مخفی نہیں رہ جائیں گے کیوں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے فرزندوں یا ان سے وابستہ افراد کے درمیان صرف وہی لوگ اس حدیث کے مصداق ہو سکتے ہیں جو ہر طرح کی لغزش و خطا سے مبرا و پاک ہیں اور امت کے درمیان طہارت ،پاکیزگی،اخلاقی فضائل اور وسیع و بیکراں علم کے ذریعہ مسلمانوں میں مشہور ہیں اور لوگ انھیں نام و نشان کے ساتھ پہچانتے ہیں ۔

ایک نکتہ کی یاد دہانی:

اس مشہوراور متفق علیہ حدیث یعنی حدیث ثقلین کا متن بیان ہو چکا اور ہم نے دیکھا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ہر جگہ ''کتاب و عترت'' کو اپنی دو یادگار کے عنوان سے یاد کیا ہے اور ان دو الٰہی حجتوں کے باہم اٹوٹ رشتہ کو ذکر کیا ہے لیکن سنت کی بعض کتابوں میں کہیں کہیں ندرت کے ساتھ ''کتاب اللہ و عترتی'' کے بجائے ''کتاب اللہ و سنتی'' ذکر ہوا ہے اور ایک غیر معتبر روایت کی شکل میں نقل ہوا ہے ۔ابن حجر عسقلانی نے اپنی کتاب[1] میں حدیث کی دوسری صورت بھی نقل کی ہے اور اس کی توجیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ : در حقیقت سنت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم جو قرآنی آیات کی مفسر ہے اس کی بازگشت خود کتاب خدا کی طرف ہے اور دونوں کی پیروی لازم وواجب ہے ۔ ہمیں اس وقت اس سے سروکار نہیں کہ یہ توجیہ درست ہے یا نہیں ۔ جو بات اہم ہے یہ ہے کہ حدیث ثقلین جسے عام طور سے اسلامی محدثوں نے نقل کیا ہے وہ وہی ''کتاب اللہ و عترتی'' ہے اور اگر جملہ ''کتاب اللہ و سنتی'' بھی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے صحیح و معتبر سند کے ساتھ نقل ہوئی ہوگی تو وہ ایک دوسری حدیث ہوگی ۔ جو حدیث ثقلین سے کوئی ٹکراؤ نہ رکھے گی ۔جبکہ یہ تعبیر

---

[1] احتجاج ج۱،ص۲۱۰

احادیث کی کتابوں میں کسی قابل اعتماد سند کے ساتھ نقل نہیں ہوئی ہے ۔اور جو شہرت و تواتر پہلی بایوں کہا جائے کہ اصل حدیث ثقلین کو حاصل ہے وہ اسے حاصل نہیں ہے۔

عترت پیغمبر ،سفینۂ نوح کے مانند:

اگر حدیث سفینہ کو حدیث ثقلین کے ساتھ ضم کردیا جائے تو ان دونوں حدیثوں کا مفاد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیت کے لئے فضائل و کمالات کی ایک دنیا کو نمایاں کرتاہے ۔ سلیم ابن قیس نے لکھا ہے کہ : میں حج کے زمانہ میں مکہ میں موجود تھا.میں نے دیکھا کہ جناب ابوذر غفاری کعبہ کے حلقہ کو پکڑے ہوئے بلند آواز میں کہہ رہے ہیں:اے لوگو!جو مجھے پہچانتا ہے وہ پہچانتاہے اور جو نہیں پہچانتا میں اسے اپنا تعارف کراتا ہوں. میں جندب بن جنادہ ''ابوذر''ہوں.اے لوگو!میں نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے کہ '':ان مثل اھل بیتی فی امتی کمثل سفینۃ نوح فی قومہ من رکبھا نجیٰ ومن ترکھا غرق''میرے اہل بیت کی مثال میری امت میں جناب نوح کی قوم میں ان کی کشتی کے مانند ہے کہ جو شخص اس میں سوار ہوا اس نے نجات پائی اور جس نے اسے ترک کردیا وہ غرق ہوگیا[1]۔ حدیث سفینہ ،حدیث غدیر اور حدیث ثقلین کے بعد اسلام کی متواتر حدیثوں میں سے ہے اور محدثین کے درمیان عظیم شہرت رکھتی ہے ۔کتاب عبقات الانوار[2] کے مولف علامہ میر حامد حسین مرحوم نے اس حدیث کو اہل سنت کے نوے ۹۰ مشہور علماء و محدثین سے نقل کیا ہے ۔[3]

حدیث سفینہ کا مفاد:

حدیث سفینہ جس میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عترت کو نوح کی کشتی سے تعبیر کیا گیا ہے.اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اہل بیت کی پیروی نجات کا سبب اور ان کی مخالفت نابودی کا سبب ہے ۔اب یہ دیکھنا چاہئے کہ کیا صرف حلال و حرام میں ان کی پیروی کرنا چاہئے اور سیاسی و اجتماعی مسائل میں ان کے ارشاد و ہدایت پر عمل کرنا واجب نہیں ہے یا یہ کہ تمام موارد میں ان کی پیروی واجب ہے اور ان

[1] احتجاج طبرسی،ص۲۲۸
[2] جزء دوم از جلد دوازدہم ،ص۹۱۴کے بعد ملاحظہ فرمائیں۔
[3] مستدرک حاکم ،ج۳،ص۳۴۳۔کنز العمال ،ج۱،ص۲۵۰۔صواعق،ص۷۵۔ فیض القدیر،ج۴،ص۳۵۶۔

کے اقوال اور حکم کو بلا استثناء جان و دل سے قبول کرنا ضروری ہے ؟جولوگ کہتے ہیں کہ اہل بیت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی صرف دین کے احکام اور حلال و حرام سے مربوط ہے وہ کسی دلیل کے بغیر پیروی کے موضوع کو محدود کرتے ہیں اور اس کی وسعت کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے جب کہ حدیث میں اس طرح کی کوئی قید و شرط نہیں ہے۔ لہٰذا حدیث سفینہ بھی اس سلسلہ میں وارد ہونے والی دوسری احادیث کی طرح اسلامی قیادت و سرپرستی کے لئے اہل بیت کی لیاقت و شائستگی کو ثابت کرتی ہے۔

اس کے علاوہ مذکورہ حدیث اہل بیت کی عصمت و طہارت اور ان کے گناہ و لغزش سے پاک ہونے کی بہترین گواہ ہے،کیونکہ ایک گناہگار و خطاکار بھلا کس طرح دوسروں کو نجات اور گمراہوں کی ہدایت کرسکتا ہے ؟!حضرت امیر المومنین ں اور ان کے جانشینوں کی ولایت اور امت اسلام کی پیشوائی و رہبری کے لئے ان کی لیاقت و شائستگی کے دلائل اس سے کہیں زیادہ ہیں اور اس مختصر کتاب میں سمیٹے نہیں جا سکتے لہٰذا ہم اتنے ہی پر اکتفا کرتے ہیں اور اپنی گفتگو کا آغاز عصمت کے موضوع سے کرتے ہیں جو الٰہی رہبروں کے لئے بنیادی شرط ہے۔

کیا انسانی معاشرہ کی قیادت و رہبری سے بڑھکر کوئی منصب تصور کیا جا سکتا ہے؟کیا کوئی شخص روحی و جسمی امتیازات کے بغیر زندگی کے کسی ایک پہلو میں بھی معاشرہ کی قیادت کا بوجھ سنبھال سکتا ہے ؟ چہ جائیکہ زندگی کے تمام مادی ومعنوی پہلوؤں میں !! جو صرف الٰہی رہبروں یعنی انبیاء وغیرہ سے مخصوص ہے؟سیاسی لیڈران جو ملک و مملکت کے صرف سیاسی مسائل میں قیادت کرتے ہیں یا اقتصادی مسائل کے ماہرین جو ملک کی اقتصادی باگڈور ہاتھ میں رکھتے ہیں ان میدانوں سے متعلق خاص شرائط و صفات کے بغیر جو انھیں دوسروں سے ممتاز و برتر ثابت کرتے ہیں ملک کے اس اعلیٰ سیاسی یا اقتصادی منصب کو حاصل ہی نہیں کر سکتے۔

اگر ایسا ہی ہے تو یہ بات بدرجہ اولی تسلیم کرنی چاہئے کہ انبیائے الٰہی اور ان کے حقیقی جانشینوں جو انسانی معاشرہ کے تمام میدانوں میں رہبر ہیں میں بھی وہ عالی اور با عظمت صفات و کمالات ہونے چاہئیں جو ان کی رہبری کی حیثیت کو ثابت کریں۔ کیوں کہ در حقیقت ان صفات اور امتیازات کی بنا پر ہی ان افراد کو یہ عظیم منصب عطا کیا گیا ہے۔

آپ ان عظیم افراد کے امتیازات کو حسب ذیل دو عنوانوں میں خلاصہ کر سکتے ہیں:

۱(۔ گناہ اور خدا کی نا فرمانی سے محفوظ رہنا ۔

۲(۔ خدا سے احکام حاصل کرنے اور لوگوں کو ان احکام کی تبلیغ کرنے میں خطا و غلطی سے محفوظ رہنا ۔ اس سے پہلے کہ الٰہی رہبروں کے لئے عصمت کے لازم ہونے کے دلائل بیان کئے جائیں ،بہتر ہے کہ خود عصمت کے بارے میں اجمال کے ساتھ یہ گفتگو کی جائے کہ کس طرح ایک شخص گناہ سے محفوظ رہتا ہے ۔

عصمت کیا ہے؟

عصمت ایک نفسانی صفت اور ایک باطنی طاقت ہے جو اپنے حامل کو گناہ ہی سے نہیں بلکہ گناہ انجام دینے کی فکر یا خیال سے بھی دور رکھتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ خدا کا باطنی خوف ہے جو انسان کو گناہ سے حتیٰ گناہ کے ارادہ سے بھی محفوظ رکھتا ہے۔ یہاں یہ سوال پیش آتا ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک شخص تمام گناہوں سے محفوظ رہے اور وہ نہ صرف گناہ نہ کرے بلکہ گناہ اور نافرمانی کے ارادہ سے بھی دور رہے ؟اس کا جواب یہ ہے کہ گناہ کی برائیوں کے علم کا لازمہ یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو گناہ سے محفوظ رکھے ۔ البتہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ گناہ کی برائیوں کے سلسلہ میں ہر درجہ کا علم انسان کو گناہ سے محفوظ و معصوم بنا دیتا ہے بلکہ علم کی حقیقت نمائی اس قدر قوی ہو جو گناہ کے برے آثار کوانسان کی نگاہ میں اس قدر مجسم کر دے کہ انسان ان برے کاموں کے انجام کو اپنی آنکھوں میں مجسم ہوتے ہوئے دیکھے ۔ اس صورت میں گناہ اس کے لئے ''محال عادی '' ہو جائے گا ۔ ذہن کو اور قریب کرنے کے لئے حسب ذیل مطلب پر توجہ دیں۔

ہم میں سے ہر ایک شخص بعض ایسے اعمال سے جن سے ہماری جان جانے کا خطرہ ہوتاہے ایک طرح سے محفوظ و معصوم ہیں ۔اس طرح کا تحفظ اس علم کی پیدا وار ہے جوان اعمال کے نتائج کے طور پر ہمیں حاصل ہے مثال کے طور پر ایک دوسرے کے دشمن دو ملک جن کی سرحدیں آپس میں ملی ہوئی ہیں اور ہر طرف کے فوجی تھوڑے فاصلہ سے بلند برجوں پر قوی دوربینوں،تیز لائٹوں اور سدھے

ہوئے کتوں کے ذریعہ سرحد کی نگرانی کررہے ہیں اور خاص طور سے کسی کے سرحد پار کرنے پر گہری نظر رکھے ہوئے ہیں کہ اگر کوئی سرحد سے ایک قسم بھی آگے بڑھا گولوں سے بھون دیا جائے گا ایسی صورت میں کوئی عقل مند انسان سرحد پار کرنے کا خیال بھی اپنے ذہن میں نہیں لاسکتا چہ جائیکہ عملا بہ اقدام کرے ۔ایسا انسان اس عمل کے سلسلہ میں ایک طرح سے محفوظ و معصوم ہے۔زیادہ دور نہ جائیں ،ہرعاقل انسان جسے اپنی زندگی سے پیار ہے ،قاتل زہر کے مقابل جس کا کھانا اس کے لئے جان لیوا ہوگا یا بجلی کے ننگے تار کے مقابل جس کا لمس کرنا اسے جلاکر سیاہ کردے گا یا اس بیمار کی بچی ہوئی غذا کے مقابل جسے ''جذام''یا ''برص''کی شدید بیماری ہوئی ہو جس کے کھانے سے اس کے اندر یہ مرض سرایت کر جائے گا،ایک طرح کا تحفظ اور عصمت رکھتا ہے۔یعنی وہ ہرگز اور کسی بھی قیمت پر یہ اعمال انجام نہیں دیتا اور اس سے ان اعمال کا ہونا ایک ''محال عادی''ہے۔

اس کا اس طرح سے محفوظ و معصوم رہنے کا سبب بھی ان اعمال کے برے نتائج کا اس کی نظر میں مجسم ہونا ہے۔ عمل کے خطرناک آثار اس کی نظر میں اس قدر مجسم اور اس کے دل کی نگاہ میں اتنے نمایاں ہوجاتے ہیں کہ ان کی روشنی میں کوئی بھی انسان اپنے ذہن میں ان کاموں کے انجام دینے کا خیال تک نہیں لاتا،چہ جائے کہ وہ یہ عمل انجام دے ڈالے۔ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شخص یتیم وبینوا کا مال ہضم کر جانے میں کوئی باک نہیں رکھتا جبکہ اس کے مقابل دوسرا شخص ایک پیسے حرام کھانے سے بھی پرہیز کرتا ہے ۔پہلا شخص پوری بے باکی کے ساتھ یتیموں کا مال کیوں کھا جاتا ہے لیکن دوسرا شخص حرام کے ایک پیسہ سے بھی کیوں پرہیز کرتا ہے؟اس کا سبب یہ ہے کہ پہلا شخص سرے سے اس قسم کی نافرمانی کے برے انجام کا اعتقاد ہی نہیں رکھتا اور اگر قیامت کا تھوڑا بہت ایمان رکھتا بھی ہے جب بھی تیزی سے تمام ہوجانے والی مادی لذتیں اس کے دل کی آنکھوں پر اس کے برے انجام کی طرف سے ایسا پردہ ڈال دیتی ہیں کہ ان کے برے آثار کا ایک ہلکا سا سایہ اس کی عقل کی نگاہوں کے سامنے سے گذر کر رہ جاتا ہے اور اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا ۔

لیکن دوسرا شخص اس گناہ کے برے انجام پر اتنا یقین رکھتا ہے کہ مال یتیم کا ہر ٹکڑا اس کی نظر میں جہنم کی آگ کے ٹکڑے کے برابر ہوتا ہے اور کوئی عقلمند انسان آگ کھانے کا اقدام نہیں کرتا ،کیونکہ وہ علم وبصیرت کی نگاہ سے دیکھ لیتا ہے کہ یہ مال کس طرح جہنم کی آگ میں بدل

جاتاہے ۔لہٰذا وہ اس عمل کے مقابل محفوظ ومعصوم رہتاہے۔اگر پہلے شخص کو بھی ایسا ہی علم اور ایسی ہی آگاہی حاصل ہوجائے تو وہ بھی دوسرے شخص کی طرح یتیم کا مال ظالمانہ طریقہ سے ہڑپ نہ کرے گا ۔جو لوگ سونے اور چاندی کا ڈھیر اکٹھا کر لیتے ہیں اور خدا کی طرف سے واجب حقوق کو ادا نہیں کرتے قرآن مجید ان کے سلسلہ میں فرماتا ہے :یہی سونا چاندی قیامت کے دن آگ میں بدل جائے گا اور اس سے ان کی پیشانی پہلوؤں اور پشت کو داغا جائے گا[1]۔ اب اگر ایسا خزانہ رکھنے والے اس منظر کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں اور یہ دیکھ لیں کہ ان جیسے افراد کا کیا انجام ہوا،اس کے بعد انھیں تنبیہ کی جائے کہ اگر تم بھی اپنی دولت کو جمع کرکے رکھوگے اور خدا کی راہ میں خرچ نہیں کروگے تو تمہارا بھی یہی انجام ہوگا تو وہ بھی فوراً اپنی چھپائی ہوئی دولت کو نکال کر خدا کی راہ میں خرچ کر ڈالیں گے۔

اکثر بعض افراد اسی دنیا میں الٰہی سزا وعذاب کے اس منظر کو دیکھے بغیر اس آیت کے مفہوم پر اس قدر ایمان رکھتے ہیں جو دیکھی ہوئی چیز پر ایمان سے کم نہیں ہوتا ۔یہاں تک کہ اگر دنیا وی و مادی پردے ان کی نگاہوں سے ہٹا دیئے جائیں جب بھی ان کے ایمان میں کوئی فرق نہیں آتا ۔ایسی صورت میں یہ شخص اس (خزانہ جمع کرنے کے) گناہ سے محفوظ رہتا ہے یعنی ہرگز سونا چاندی اکٹھا نہیں کرتا ۔ اب اگر ایک شخص یا ایک گروہ کائنات کے حقائق کے سلسلہ میں کامل اور حقیقی آگاہی و معرفت رکھنے کی وجہ سے تمام گناہوں کے انجام کے سلسلہ میں ایسی ہی حالت رکھتا ہو اور گناہوں کی سزا ان پر اس قدر نمایاں اور واضح ہو کہ مادی حجاب نگاہوں سے اٹھنے یا زمان و مکان کے فاصلوں کے باوجود ان کے ایمان و اعتقاد میں کوئی فرق نہیں آتا تو اس صورت میں یہ شخص یا وہ گروہ ان تمام گناہوں کے مقابل سو فی صدی تحفظ اور عصمت رکھتا ہے ۔

نتیجہ میں ان سے نہ صرف گناہ سرزد نہیں ہوتے بلکہ انھیں گناہ کا خیال بھی نہیں آتا ۔لہٰذا یہ کہنا چاہئے کہ عصمت کسی ایک چیز یا تمام چیزوں میں اعمال کے انجام و نتائج کے قطعی علم اور شدید ایمان کے اثر سے پیدا ہوتی ہے،اور ہر انسان بعض امور کے سلسلہ میں ایک طرح کی عصمت رکھتا ہے مگر انبیائے الٰہی اعمال کے انجام سے مکمل آگاہی اور خدا کی عظمت کی کامل معرفت کی وجہ سے تمام گناہوں کے مقابل مکمل عصمت رکھتے ہیں اور اسی علم و یقین کی بنا پر گناہ کے تمام اسباب، خواہشوں اور شہوتوں پر قابو رکھتے ہیں اور ایک لمحہ کے لئے

[1] "یوم یحمیٰ علیھا فی نار جھنم فتکویٰ بھا جباھھم و ظھورھم ھذا ما کنزتم لا نفسکم فذوقوا ما کنتم تکنزون" سورہ توبہ ،۳۵

بھی خدا کے معین کردہ حدود سے سرکشی نہیں کرتے ۔آخر میں اس نکتہ کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے کہ یہ صحیح ہے کہ انبیائے کرام گناہ اور ہر طرح کی نافرمانی سے محفوظ ہیں، لیکن اس تحفظ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ گناہ کے کام انجام دینے کی توانائی نہیں رکھتے اور خدا کا حکم بجا لانے پر مجبور ہیں ۔ بلکہ یہ حضرات بھی تمام انسانوں کی طرح عمل کی آزادی اور اختیار رکھتے ہیں اور اطاعت یا نافرمانی دونوں پر انھیں قدرت حاصل ہے لیکن یہ لوگ اپنی باطنی آنکھوں سے جو کائنات کے حقائق سے متعلق ان کے وسیع علم کی وجہ سے انھیں حاصل ہوئی ہیں اعمال کے نتائج و انجام کا مشاہدہ کر لیتے ہیں اور ان نتائج سے جنھیں شریعت کی زبان میں عذاب کہا جاتا ہے ،واقف و آگاہ رہتے ہیں، لہٰذا ہر طرح کے گناہ اور نافرمانی سے پرہیز کرتے ہیں ۔اسے سمجھنے کے لئے حسب ذیل عبارت پر غور کیجئے: اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ خدا وند عالم ہر طرح کے برے اور قبیح کام انجام دینے پر قادر ہے لیکن اس سے کبھی اس طرح کام صادر نہیں ہوتا جو اس کے عدل اور اس کی حکمت کے خلاف ہو اس کے باوجود ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ ان کاموں کو انجام دینے کی قدرت نہیں رکھتا ۔بلکہ وہ ہر شئے پر قادر ہے ۔

معصوم افراد بھی گناہ کے سلسلہ میں یہی کیفیت رکھتے ہیں وہ لوگ بھی گناہ کرنے کی قدرت و توانائی رکھنے کے باوجود معصیت و گناہ کی طرف نہیں جاتے۔ علمائے عقائد نے الٰہی رہبروں خصوصاً انبیاء کرام کی عصمت کے بارے میں متعدد دلائل بیان کئے ہیں ہم یہاں ان میں سے دو دلیلیں بیان کرتے ہیں۔یہ صحیح ہے کہ ان علماء نے یہ دلیلیں انبیاء کی عصمت کے لئے بیان کی ہیں لیکن یہی دلیلیں جس طرح انبیاء کی عصمت کو ثابت کرتی ہیں اسی طرح اماموں کی عصمت کو بھی ثابت کرتی ہیں ۔کیونکہ امامت شیعی نقطۂ نظر سے رسالت اور نبوت کا ہی تسلسل ہے ۔فرق یہ ہے کہ انبیاء منصب نبوت رکھتے ہیں اور ان کا رابطہ وحی الٰہی سے ہے اور امام کے یہاں یہ دو صفتیں نہیں ہیں ۔لیکن اگر ان دو خصوصیتوں سے صرف نظر کریں تو انبیاء اور اماموں کے درمیان کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا ۔اب یہ دونوں دلیلیں ملاحظہ ہوں: ا۔تربیت عمل کے سایہ میں: اس میں کوئی شک نہیں کہ انبیائے کرام کی بعثت کا مقصد انسانوں کی تربیت اور ان کی راہنمائی ہے اور تربیت کے مؤثر اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی ہے کہ مربی میں ایسے صفات پائے جائیں جن کی وجہ سے لوگ اس سے قریب

ہوجائیں ۔مثال کی طور پر اگر کوئی مربی خوش گفتار ، فصیح اور نپی تلی بات کرنے والا ہو لیکن بعض ایسے نفرت انگیز صفات اس میں پائے جائیں جس کے سبب لوگ اس سے دور ہوجائیں تو ایسی صورت میں انبیاء کی بعثت کا مقصد ہی پورا نہیں ہوگا ۔ایک مربی ورہبر سے لوگوں کی دوری اور نفرت کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ اس کے قول وفعل میں تضاد اور دورنگی پائی جاتی ہو۔اس صورت میں نہ صرف اس کی راہنمائیاں بے قدر اور بیکار ہوجائیں گی بلکہ اس کی نبوت کی اساس وبنیاد ہی متزلزل ہوجائے گی ۔شیعوں کے مشہور اور بزرگ عالم سید مرتضیٰ علم الھدیٰ نے اس دلیل کو یوں بیان کیا ہے:اگر ہم کسی کے فعل کے بارہ میں اطمینان نہیں رکھتے یعنی اگر ہمیں یہ شبہ ہے کہ وہ کوئی گناہ انجام دیتاہے تو ہم اطمینان قلب کے ساتھ اس کی بات پر دھیان نہیں دیتے ۔اور ایسے شخص کی باتیں ہم پر اثر نہیں کرسکتیں جس کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ وہ خود اپنی بات پر عمل نہیں کرتا ۔جس طرح مربی یار ہبر کا گناہ کرنا لوگوں کی نظر میں اسے کم عقل ،بے حیا اور لاابالی ثابت کرتاہے اور لوگوں کو اس سے دور کردیتاہے اسی طرح مربی یا رہبر کے قول وفعل کی دو رنگی بھی لوگوں پر اس کے خلاف منفی اثر ڈالتی ہے ۔

اگر کوئی ڈاکٹر شراب کے نقصانات پر کتاب لکھے یا کوئی متأثر کرنے والی فلم دکھائے لیکن خود لوگوں کے مجمع میں اس قدر شراب پئے کہ اپنے پیروں پر کھڑا نہ ہوسکے ۔ایسی صورت میں شراب کے خلاف اس کی تمام تحریریں ،تقریریں اور زحمتیں خاک میں مل جائیں گی۔ فرض کیجئے کہ کسی گروہ کا رہبر کرسی پر بیٹھ کر عدل وانصاف اور مساوات کی خوبیاں بیان کرنے کے لئے زبردست تقریر کرے لیکن خود عملی طور سے لوگوں کا مال ہڑپ کرتارہے تو اس کا عمل اس کی کہی ہوئی باتوں کو بے اثر بنادے گا ۔خداوند عالم اسی وجہ سے انبیاء کو ایسا علم وایمان اور صبر وحوصلہ عطا کرتاہے تاکہ وہ تمام گناہوں سے خود کو محفوظ رکھیں ۔

اس بیان کی روشنی میں انبیائے الٰہی کے لئے ضروری ہے کہ وہ بعثت کے بعد یا بعثت سے پہلے اپنی پوری زندگی میں گناہوں اور غلطیوں سے دور رہیں اور ان کا دامن کسی بھی طرح کی قول وفعل کی کمزوری سے پاک اور نیک صفات سے درخشاں رہنا چاہئے ۔کیونکہ اگر کسی شخص نے اپنی عمر کا تھوڑا سا حصہ بھی لوگوں کے درمیان گناہ اور معصیت کے ساتھ گزارا ہو اور اس کی زندگی کا نامۂ اعمال سیاہ اور

کمزوریوں سے بھرا ہو تو ایسا شخص بعد میں لوگوں کے دلوں میں گھر نہیں کرسکتا اور لوگوں کو اپنے اقوال وکردار سے متاثر نہیں کرسکتا ۔خداوند عالم کی حکمت کا تقاضا ہے کہ وہ اپنے نبی ورسول میں ایسے اسباب وصفات پیدا کرے کہ وہ ہر دل عزیز بن جائیں ۔اور ایسے اسباب سے انھیں دور رکھے جن سے لوگوں کے نبی یا رسول سے دور ہونے کا خدشہ ہو ۔ظاہر ہے کہ انسان کے گزشتہ برے اعمال اور اس کا تاریک ماضی لوگوں میں اس کے نفوذ اور اس کی ہر دلعزیزی کو انتہائی کم کردے گا اور لوگ یہ کہیں گے کہ کل تک تو وہ خود بد عمل تھا،آج ہمیں ہدایت کرنے چلاہے؟!

۲۔اعتماد جذب کرنا: تعلیم وتربیت کے شرائط میں سے ایک شرط ،جو انبیاء یا الٰہی رہبروں کے اہم مقاصد میں سے ہے ،یہ ہے کہ انسان اپنے مربی کی بات کی سچائی پر ایمان رکھتا ہوکیونکہ کسی چیز کی طرف ایک انسان کی کشش اسی قدر ہوتی ہے جس قدر وہ اس چیز پر اعتماد وایمان رکھتا ہے ۔ایک اقتصادی یا صحی پروگرام کا پر جوش استقبال عوام اسی وقت کرتے ہیں جب کوئی اعلیٰ علمی کمیٹی اس کی تائید کردیتی ہے ۔کیونکہ بہت سے ماہروں کے اجتماعی نظریہ میں خطا یا غلطی کا امکان بہت کم پایا جاتا ہے ۔

اب اگر مذہبی پیشواؤں کے بارے میں یہ امکان ہو کہ وہ گناہ کرتے ہوں گے تو قطعی طور سے جھوٹ یا حقائق کی تحریف کا امکان بھی پایا جاتا ہوگا ۔اس امکان کی وجہ سے ان کی باتوں سے ہمارا اطمینان اٹھ جائے گا ۔ اسی طرح انبیاء کا مقصد جو انسانوں کی تربیت اور ہدایت ہے ہاتھ نہ آئے گا ۔ممکن ہے یہ کہا جائے کہ اعتماد واطمینان حاصل کرنے کے لئے یہ کافی ہے کہ دینی پیشوا جھوٹ نہ بولیں اور اس گناہ کے قریب نہ جائیں تا کہ انھیں لوگوں کا اعتماد حاصل ہو ۔بقیہ سارے گناہوں سے ان کا پرہیز کرنا لازم نہیں ہے کیونکہ دوسرے گناہوں کے کرنے یا نہ کرنے سے مسئلہ اعتماد واطمینان پر کوئی اثر نہیں پڑتا ۔جواب یہ ہے کہ اس بات کی حقیقت ظاہر ہے ،کیونکہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک شخص جھوٹ بولنے پر آمادہ نہ ہو لیکن دوسرے گناہوں مثلاً آدم کشی ،خیانت اور بے عفتی وبے حیائی کے اعمال کرنے میں اسے کوئی باک نہ ہو؟!اصولاً جو شخص دنیا کی لمحاتی لذتوں کے حصول کے لئے ہر طرح کے گناہ انجام دینے پر آمادہ ہو وہ ان کے حصول کے لئے

جھوٹ کیسے نہیں بول سکتا ۔؟![1] اصولی طور سے انسان کو گناہ سے روکنے والی طاقت ایک باطنی قوت یعنی خوف خدا اور نفس پر قابو پاناہے ۔جس کے ذریعہ انسان گناہوں سے دور رہتا ہے ۔پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ جھوٹ کے سلسلہ میں تو یہ قوت کام کرے لیکن دوسرے گناہوں کے سلسلہ میں جو عموماً بہت برے اور وجدان و ضمیر کی نظر میں جھوٹ سے بھی زیادہ قبیح ہوں یہ قوت کام نہ کرے ؟!اور اگر ہم اس جدائی کو ثبوت کے طور پر قبول کر بھی لیں تو اثبات کے طور سے یعنی عملاً عوام اسے قبول نہیں کریں گے۔کیونکہ لوگ اس طرح کی جدائی کو ہرگز تسلیم نہیں کرتے۔اس کے علاوہ گناہ جس طرح گناہ گار کو لوگوں کی نظر میں قابل نفرت بنا دیتے ہیں اسی طرح لوگ اس کی باتوں پر بھی اعتماد و اطمینان نہیں رکھتے اور ''انظر الیٰ ما قال ولاتنظر من الیٰ قال''یعنی یہ دکھو کیا کہہ رہاہے یہ نہ دیکھو کون کہہ رہاہے کا فلسفہ فقط ان لوگوں کے لئے مؤثر ہے جو شخصیت اور اس کی بات کے درمیان فرق کرنا چاہتے ہیں لیکن ان لوگوں کے لئے جو بات کی قدر قیمت کو کہنے والے کی شخصیت اور اس کی طہارت وتقدس کے آئینہ میں دیکھتے ہیں یہ فلسفہ کارگر نہیں ہوتا ۔یہ بیان جس طرح رہبری وقیادت کے منصب پر آنے کے بعد صاحب منصب کے لئے عصمت کو ضروری جانتاہے،اسی طرح صاحب منصب ہونے سے پہلے اس کے لئے عصمت کو لازم وضروری سمجھتاہے ۔کیونکہ جو شخص ایک عرصہ تک گناہ گارو لاابالی رہاہواور اس نے ایک عمر جرائم وخیانت اور فحشا وفساد میں گزاری ہو، چاہے وہ بعد میں توبہ بھی کرلے ،اس کی روح میں روحی ومعنوی انقلاب بھی پیدا ہوجائے اور وہ متقی وپرہیزگاراور نیک انسان بھی ہوجائے لیکن چونکہ لوگوں کے ذہنوں میں اس کے برے اعمال کی یادیں محفوظ ہیں لہذا لوگ اس کی نیکی کی طرف دعوت کو بھی بد بینی کی نگاہ سے دیکھیں گے اور بسا اوقات یہ تصور بھی کر سکتے ہیں کہ یہ سب اس کی ریاکاریاں ہیں وہ اس راہ سے لوگوں کو فریب دینا اور شکار کرنا چاہتاہے۔اور یہ ذہنی کیفیت خاص طورسے تعبدی مسائل میں جہاں عقلی استدلال اور تجزیہ کی گنجائش نہیں ہوتی،زیادہ شدت سے ظاہر ہوتی ہے۔

---

[1] اس کے علاوہ گناہ کرنے والے اگر جھوٹ نہ بولیں گے تو اس کالازمہ یہ ہوگا کہ وہ سچائی کے ساتھ اپنے گناہوں کا اعتراف کریں اور جب لوگ ان کی برائیوں سے آگاہ ہوجائیں گے تو فطری طور سے ان کا وقار اور ان کی عزت خاک میں مل جائے گی اور لوگ ان سے نفرت کرنے لگیں گے۔نتیجہ میں دوبارہ وہی مشکل پیش آئے گی کہ مربی اپنے عملی گناہ کے سبب لوگوں میں اپنی عزت گنوادے گا۔

مختصر یہ کہ شریعت کے تمام اصول و فروع کی بنیاد استدلال و تجربہ پر نہیں ہوتی کہ الٰہی رہبر ایک فلسفی یا ایک معلم کی طرح سے اس راہ کو اختیار کرے اور اپنی بات استدلال کے ذریعہ ثابت کرے ،بلکہ شریعت کی بنیاد وحی الٰہی اور ایسی تعلیمات پر ہے کہ انسان صدیوں کے بعد اس کے اسرار و علل سے آگاہ ہوتا ہے اور اس طرح کی تعلیمات کو قبول کرنے کے لئے شرط یہ ہے کہ لوگ الٰہی رہبر کے اوپر سو فی صد ی اعتماد کرتے ہوں کہ جو کچھ وہ سن رہے ہیں اسے وحی الٰہی اور عین حقیقت تصور کریں ،اور ظاہر ہے کہ یہ حالت ایسے رہبر کے سلسلے میں لوگوں کے دلوں میں ہر گز پیدا نہیں ہو سکتی جس کی زندگی ابتدا سے انتہا تک روشن و درخشاں اور پاک و پاکیزہ نہ ہو[1] ۔

یہ دو دلیلیں نہ صرف انبیائے کرام کے لئے عصمت کی ضرورت کو ثابت کرتی ہیں ،بلکہ یہ بھی ثابت کرتی ہیں کہ انبیاء کے جانشینوں کو بھی انبیاء کی طرح معصوم ہونا چاہئے ،کیوں کہ امامت کا منصب اہل سنت کے نظریہ کے برخلاف کوئی حکومتی اور معمولی منصب نہیں ہے ،بلکہ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں امامت کا منصب ایک الٰہی منصب ہے اور امام پیغمبر کے ساتھ (نبوت اور وحی کے علاوہ) تمام منصبوں میں شریک ہے ۔ امام ،دین کا محافظ و نگہبان اور قرآن کے مجمل مطالب کی تشریح کرنے والا ہے نیز ایسے بہت سے احکام کو بیان کرنے والا ہے جنھیں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیان کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے تھے ۔

اس لئے امام مسلمانوں کا حاکم اور ان کی جان و مال و ناموس کا نگہبان بھی ہے اور شریعت کو بیان کرنے والا اور الٰہی معلم و مربی بھی ہے اور ایک مربی کو معصوم ہونا چاہئے ،کیوں کہ اگر اس سے کوئی بھی چھوٹا یا بڑا گناہ سرزد ہوا تو اس کی تربیت بے اثر ہو جائے گی ۔ اور اس کی گفتار و کردار کی صحت و درستگی پر سے لوگوں کا اعتماد اٹھ جائے گا ۔لوگوں کا اعتماد جزب کرنے کا لازمہ یہ ہے کہ پیغمبر اپنی زندگی کے تمام ادوار میں چاہے وہ رہبری سے پہلے کی زندگی ہو یا اس کے بعد والی زندگی ہر طرح کے گناہ لغزش اور الودگی سے پاک و پاکیزہ ہو ۔ کیوں کہ یہ بے دھڑک اور سو فی صدی اعتماد اسی وقت ممکن ہے جب اس شخص سے کبھی کوئی گناہ ہوتے ہوئے نہ دیکھا جائے ۔ جو لوگ اپنی زندگی کا کچھ حصہ گناہ اور آلودگی میں بسر کرتے ہیں ، اسکے بعد توبہ کرتے ہیں ، ممکن ہے کہ ایک حد تک لوگوں کا اعتماد جذب

[1] اسی کتا ب کی تیسری ،چوتھی اور پانجویں فصلیں ملاحظہ فرمائیں

کرلیں لیکن سو فی صد ی اعتماد تو بہر حال جذب نہیں کر سکتے ۔ساتھ ہی اس بات سے یہ نتیجہ بھی حاصل کیا جاسکتا ہے کہ رہبروں کو عمد ی گناہ کے ساتھ ساتھ سہو اور بھول سے کئے گئے گناہ سے بھی محفوظ ہونا چاہئے،کیوں کہ عمدی گناہ اعتماد کو سلب کر لیتا ہے اور سہوی گناہ اگر چہ بعض موارد میں اعتماد سلب کرنے کا باعث نہیں ہوتا لیکن انسان کی شخصیت کو نا قابل تلافی نقصان پہنچاتا اور اس کی شخصیت کو بر ی طرح مجروح کر دیتا ہے اگر چہ سہوی گناہ کی سزا نہیں ہے اور انسان،دین و عقل کی نگاہ سے معذور سمجھا جاتا ہے.

لیکن رائے عامہ پر اس کا برا اثر پڑتا ہے اور لوگ ایسے شخص سے دور ہو جاتے یا میں خاص طور سے اگر گناہ بھول سے کسی کو قتل کرنے کا یا اسی جیسا ہو ۔یہ طے ہے کہ اہم اور بڑی ذمہ داریوں کی انجام دہی کے لئے حالات و شرائط بھی سنگین ہوتے ہیں۔ذمہ داری جتنی بڑی اور جتنی سنگین ہوتی ہے،شرائط بھی اسی لحاظ سے سنگین اور سخت ہوتے ہیں ۔ایک امام جماعت کے شرائط عدالت کے اس قاضی کے برابر نہیں ہیں جس کے اختیار میں لوگوں کی جان و مال ہوتے ہیں۔نبوت اور امامت عظیم ترین منصب ہے جو خدا کی طرف سے انسانوں کو عطا ہوا ہے،جو افراد اس منصب پر فائز ہوتے ہیں وہ خدا وند عالم کی طرف سے لوگوں کی جان و مال وناموس پر مکمل تسلط و اختیار رکھتے ہیں اور ان کا ارادہ لوگوں کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر نافذ ہوتا ہے۔قرآن مجید پیغمبر اکرمؐ کے بارے میں فرماتا ہے :''النبی اولیٰ بالمومنین من انفسھم[۱]''یعنی پیغمبر،باایمان لوگوں کی جانوں پر ان سے زیادہ حق رکھتا ہے۔پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حدیث غدیر کے خطبہ میں خود کو اور حضرت علی علیہ السلام کو لوگوں کیجانوں پر ان سے زیادہ اولیٰ اور صاحب اختیار بتایا ۔کیا یہ ممکن ہے کہ حکمت و تدبیر ولا خدا ایسے عظیم اور اہم منصب کی باگڈور ایک غیر معصوم شخص کے ہاتھ میں دیدے ''اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ''

[۱] ۱۔ احزاب ،۳۲

قرآن کی راہنمائی

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صاحبان امر (اولی الامر[1]) قرآن کے صاف حکم کے مطابق واجب الاطاعت ہیں اور جس طرح ہم خدا کے فرمان کی اطاعت کرتے ہیں یوں ہی ان کے حکم کی اطاعت بھی ہم پر واجب ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: ''اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم''یعنی خدا کی اطاعت کرو ،اس کے رسول کی اور صاحبان امر کی اطاعت کرو[2]۔ یہ آیت باکل واضح طور سے صاحبان امر کی بلا قید و شرط اطاعت کا حکم دیتی ہے ۔ اگر یہ افراد سو فی صدی گناہ و خطا سے محفوظ ہوں گے جب ہی خدا وند عالم کی طرف سے ان کی بلا قید و شرط اطاعت کا واجب کیا جانا صحیح ہوگا ۔

کیوں کہ اگر ہم ان کی عصمت کو تسلیم کرلیں تومعصوم کی بے قید و شرط اطاعت پر کوئی اعتراض نہ ہوگا ،لیکن اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ(اولی الامر)یعنی صاحبان امر کا گروہ جن کی اطاعت ہم پر واجب کی گئی ہے ۔

معصوم نہ ہوں بلکہ گناہ گار و خطا کار افراد ہوں تو ایسی صورت میں خدا وند عالم یہ کیسے حکم دے گا کہ ہم ان لوگوں کی بلاقید و شرط پیروی کریں؟!لہٰذا اگرہم پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانشینوں کے لئے عصمت کو شرط نہ جانیں اور فرض کریں کہ کسی جانشین نے کسی مظلوم کے قتل یا کسی بے گناہ کا مال و جائداد ضبط کئے جانے کا حکم دے دیا اور ہم جانتے ہوں کہ وہ شخص مظلوم یا بے گناہ تھا تو ایسی صورت میں ہمیں قرآن کے حکم کے مطابق اس جانشین کے فرمان پر موبمو عمل کرنا ہوگا یعنی اس مظلوم کو قتل یا بے گناہ کا مال ضبط کرنا ہوگا ۔

لیکن اگر ہم یہ کہیں کہ قرآن کریم نے ''اولی الامر ''کی پیروی کو خدا اور رسول کی اطاعت کے ساتھ قرار دیا ہےاور ان تینوں اطاعتوں کو بلا قید و شرط شمار کیا ہے تو اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ''اولی الامر '' رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہی طرح گناہ و خطا سے معصوم ہیں ۔

لہٰذا اب ہم یہ کہیں گے کہ کبھی کوئی معصوم ''اولی الامر ''کسی مظلوم کے قتل یا کسی بے گناہ کا مال ضبط کرنے کا حکم نہیں دیتا ۔

---

[1] یہ وہی صاحبان امر ہیں جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مسلمانوں کے امور کے ذمہ دار ہیں یا کم از کم مصداق ''اولی الامر''ہیں۔
[2] نساء ۵۹

ایک سوال کا جواب:

ممکن ہے یہ کہا جائے کہ اولی الامر کی اطاعت اسی صورت میں واجب ہے جب وہ شریعت اور خدا و رسول کے صاف حکم کے مطابق عمل کرے ۔ور نہ دوسری صورت میں نہ صرف ان کی اطاعت واجب نہیں ہے بلکہ ان کی مخالفت کرنی چاہئے۔ اس سوال کا جواب واضح ہے ۔کیوں کہ یہ بات اسی وقت عملی ہے جب اول یہ کہ تمام لوگ الٰہی احکام اور فروع دین سے مکمل آگاہی رکھتے ہوں اور حرام و حلال کی تشخیص دے سکتے ہوں ۔ دوسرے یہ کہ اس قدر جرأت و شجاعت رکھتے ہوں کہ حاکم کے قہر و غضب سے خوف زدہ نہ ہوں جب ہی یہ ممکن ہے کہ وہ حاکم کا حکم شریعت سے مطابق ہونے کی صورت میں بجالائیں ورنہ دوسری صورت میں اس سے مقابلہ کے لئے اٹھ کھڑے ہوں ۔

لیکن افسوس کہ عام طور سے لوگ الٰہی احکام سے پوری آگاہی نہیں رکھتے کہ ''اولی الامر '' کے فرمان کو تشخیص دے سکیں بلکہ لوگوں کی اکثریت اس بات کی توقع رکھتی ہے کہ '' اولی الامر '' کے ذریعہ الٰہی احکام سے آگاہ ہوں اسی طرح جو طاقت سب پر مسلط ہے اس کی مخالفت بھی کوئی آسان بات نہیں ہے اور ہر ایک اس کے انجام کو برداشت نہیں کرسکتا ۔اس کے علاوہ اگر قوم کو ایسے اختیارات حاصل ہو جائیں تو لوگوں کے دلوں میں سرکشی کا جذبہ پیدا ہو گا اور نظام درہم و برہم ہو جائے گا اور ہر شخص کسی نہ کسی بہانہ سے ''اولی الامر ''کی اطاعت سے انکار کرے گا اور قیادت کی مشینری میں خلل پیدا ہو جائے گا یہی وجہ ہے کہ اس آیت کریمہ کی روشنی میں یہ یقین کیا جا سکتا ہے کہ ''اولی الامر ''کا منصب ان لوگوں کے لئے ہے جن کی اطاعت بلا قید و شرط واجب کی گئی ہے اور یہ افراد معصوم شخصیتوں کے علاوہ کوئی اور نہیں ہیں جن کا دامن ہر طرح کے گناہ ،خطا ،یا لغزش سے پاک ہے۔

قرآن کی دوسری راہنمائی:

قرآن کریم میں ایک دوسری آیت جو امامت سے متعلق گفتگو کرتی ہے پوری بلاغت کے ساتھ ظلم وستم سے پرہیز کو امامت کے لئے شرط قرار دیتی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے ''؛اذ ابتلیٰ ابراھیم ربہ بکلمات فاتمھن قال انی جاعلک للناس اماماً قال و من ذریتی قال لاینال

عھد ی الظالمین '' [1]''یعنی جب ابراہیمؑ کوان کے پروردگار نے بعض امور کے لئے آزمایا اور وہ تمام امتحانوں میں کامیاب ہوئے تو ان سے ارشاد ہوا کہ میں نے تم کو لوگوں کا پیشوا و امام قرار دیا ۔ (جناب ابراہیمؑ نے) عرض کیا : میری ذریت اور میری اولاد کو بھی یہ منصب نصیب ہوگا تو جواب ملا کہ میرا عہد ستم گاروں تک نہیں پہنچے گا'' 'امامت ،نبوت کے مانند الٰہی منصب ہے جو صرف صالح اور شائستہ افراد کو ہی ملتاہے اس آیت میں جناب ابراہیمؑ نے خدا سے یہ تقاضا کیا کہ میری اولاد کے حصہ میں بھی یہ منصب آئے لیکن فوراً خدا وند عالم کا خطاب ہوا کہ ظالم و ستمگر افراد تک یہ منصب نہیں پہنچے گا ۔ مسلّم طور سے اس آیت میں ظالم سے مراد وہ افراد ہیں جو گناہوں سے آلودہ ہیں ، کیوں کہ ہر طرح کا گناہ اپنے آپ پر ایک ظلم اور خدا کی بارگاہ میں نافرمانی کی جسارت ہے ۔ اب یہ دیکھنا چاہئے کہ کون سے ظالم لوگ اس آیت کے حکم کے مطابق منصب قیادت و امامت سے محروم ہیں ۔ اصولی طور سے جو شخصیتیں لوگوں کی پیشوائی اور حاکمیت کی باگڈور سنبھالتی ہیں وہ چار ہی طرح کی ہوتی ہیں:

۱۔ یا وہ زندگی بھر ظالم رہے ہیں چاہے منصب حاصل کرنے سے پہلے یا اس کے بعد ۔

۲۔ یاانہوں نے پوری عمر میں کبھی گناہ نہیں کیا ۔

۳۔ حاکم ہونے سے پہلے ظالم و ستمگر تھے لیکن قیادت وپیشوائی حاصل کرنے کے بعد پاک صاف ہوگئے ۔

۴۔ یہ تیسری قسم کے برعکس ہے یعنی حکومت ملتے ہی ظلم و ستم شروع کردیا اس سے پہلے گناہ نہیں کرتے تھے ۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ جناب ابراہیمؑ نے ان چار گروہوں میں سے کس کے لئے اس منصب کی آرزو کی تھی؟یہ تو ہرگز سوچا نہیں جاسکتا کہ جناب ابراہیمؑ نے پہلے اور چوتھے گروہ کے لئے اس عظیم منصب کی آرزو کی ہوگی ۔کیونکہ جو لوگ حاکمیت کے دوران ظالم و ستمگر میں کسی بھی صاحب عقل اور صائب رائے رکھنے والے کی نظر میں اس منصب کے لائق نہیں ہوتے ہیں ،چہ جائیکہ ابراہیمؑ خلیل کی نگاہ میں ۔ جنھوں نے خود کتنے سنگین امتحانات دیئے،ساری زندگی پاکیزگی کے ساتھ بسر کرنے اور گناہ و ظلم سے مسلسل لڑنے کے بعد یہ عظیم

[1] بقرہ ،۱۲۴

منصب حاصل کیا ہے وہ ہرگز مذکورہ دوگروہوں کے لئے تمام انسانوں پر امامت کی آرزو نہیں کر سکتے ۔ظاہر ہے کہ جناب ابراہیمؑ کا مقصود دوسری دو قسم کی شخصیتیں تھیں ۔اس صورت میں جملۂ ''لاینال ''کی شرط کے ذریعہ تیسرا گروہ بھی نکل جاتاہے اور منصب امامت کے لئے صرف وہی گروہ رہ جاتا ہے جس نے اپنی پوری زندگی میں کبھی کوئی گناہ نہیں کیاہے۔

اگر چہ کتاب اپنے اختتام کو پہنچ چکی تھی لیکن یہاں دوموضوع پر گفتگو لازمی وضروری ہے۔ا۔حدیث ثقلین سے متعلق گفتگوہوتی ہے توبعض اہل سنت لفظ ''عترتی''کی جگہ ''سنتی ''استعمال کرتے ہیں اور ''کتاب اللہ وسنتی''کہتے ہیں۔

۲۔اہل سنت حضرات پیغمبر اکرمؐ پر درود بھیجتے وقت ان کی آل کو شامل نہیں کرتے ۔یہ دو موضوع شیعہ اور اہل سنت دونوں گروہوں کے درمیان اختلاف کا سبب ہیں لہٰذا یہاں ان دونوں موضوعات کا جائزہ لیاجارہاہے۔

ا۔ کون سی تعبیر صحیح ہے: امامیہ متکلمین جیسے صدوق ،طوسی اور مفید رضوان اللہ علیھم نے بہت سے کلامی مسائل میں پیغمبر اکرم ﷺ کی عترت واہل بیتؑ کی احادیث سے استدلال کیا ہےاور اس سلسلہ میں حدیث ثقلین کا سہارا لیتے ہیں جب کہ بعض محدثوں نے مذکورہ حدیث کو دوسری شکل میں نقل کیا ہے اور لفظ ''عترتی''کے بجائے ''سنتی ''لائے ہیں ۔حدیث ثقلین کے متن میں اس اختلاف کے ہوتے ہوئے اس کے ذریعہ کلامی مسائل میں استدلال کیسے کیا جاسکتا ہے ؟

وضاحت: امامیہ شیعہ جو اصول وعقائد میں برہان وعقلی دلیل کی پیروی کرتے ہیں،اہل بیتؑ کے اقوال و احادیث کوبھی اگر صحیح نقل ہوئی ہوں تواصول وفروع میں حجت جانتے ہیں ۔فرق یہ ہے کہ فروعی وعملی مسائل میں خبر صحیح کو مطلق طور سے حجت جانتے ہیں چاہے وہ خبر واحد کی صورت میں کیوں نہ ہو لیکن اصول وعقائد سے مربوط مسائل میں چونکہ مقصد اعتقاد ویقین پیدا کرنا ہےاور خبر واحد یقین کی حد تک نہیں پہنچاتی لہٰذا صرف اس قطعی خبر کو جس سے یقین وعلم حاصل ہوتا ہو حجت شمار کرتے ہیں ۔اہل بیتؑ کے اقوال کی حجیت کی ایک دلیل حدیث ثقلین ہے جسے بہت سے اسلامی محدثوں نے قبول کیا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ نے ارشاد فرمایاہے: ''انی تارک فیکم الثقلین کتاب اللہ وعترتی ماان تمسکتم بھما لن تضلوا''،لیکن چونکہ بعض روایات میں ''عترتی''کے بجائے ''سنتی ''آیاہے

،اسی لئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان دو روایتوں میں سے کون صحیح ودرست ہے ؟اس لئے کلامی مسائل میں اہل بیتؑ کی احادیث کے ذریعہ استدلال پر سوالیہ نشان لگ گیاہے ؟جس کے جواب میں علمائے شیعہ کی طرف سے رسالے اور کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں سب سے اہم کتاب ''دار التقریب بین المذاہب الاسلامیۃ''کی جانب سے قاہرہ مصر میں شائع ہو چکی ہے ۔ابھی کچھ عرصہ پہلے اردن کے ایک اہل سنت عالم ''شیخ حسن بن علی سقاف''نے اس سوال کا جواب دیاہے ،ہم قارئین کرام کی خدمت میں اس کا ترجمہ پیش کرتے ہیں اور چونکہ ان کا جواب سوفیصدی تحقیقی ہے لہٰذا اسی پر اکتفاکرتے ہیںآخر میں ایک یاد دہانی شیخ سقاف کی خدمت میں بھی کریں گے۔

سوال:مجھ سے حدیث ثقلین کے بارے میں سوال کیا گیا اور دریافت کیا گیا ہے کہ ''عترتی واھل بیتی''صحیح ہے یا ''کتاب اللہ وسنتی''آپ سے درخواست ہے کہ سند کے اعتبار سے اس حدیث کی وضاحت فرمائیے۔

جواب:اس متن کو دو بڑے محدثوں نے نقل کیاہے:۱۔ مسلم نے اپنی صحیح میں جناب زید بن ارقمؓ سے نقل کیاہے ۔وہ کہتے ہیں کہ پیغمبر اسلامؐ نے ایک روز مکہ اور مدینہ کے درمیان ''خُم''نام کی جگہ پر ایک خطبہ ارشاد فرمایااور اس میں خدا کی حمد وثنا اور لوگوں کو نصیحت فرمائی ۔اس کے بعد فرمایا'':یا ایھا الناس!فانما انا بشر یوشک ان یاتی رسول ربی فاجیب وانا تارک فیکم ثقلین :اولھا کتاب اللہ فیہ الھدیٰ والنور ،فخذوا بکتاب اللہ واستمسکوا بہ فحثّ علیٰ کتاب اللہ ورغّب فیہ ثم قال واھل بیتی،اذکّرکم اللہ فی اھل بیتی،اذکّرکم اللہ فی اھل بیتی،اذکّرکم اللہ فی اھل بیتی''اے لوگو !میں انسان ہوں ممکن ہے کہ عنقریب خدا کا فرستادہ میرے پاس آئے اور میں اس کی دعوت پر لبیک کہوں ۔میں تمہارے درمیان دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں ۔ایک اللہ کی کتاب ہے،جس میں ہدایت و نور ہے ۔پس اللہ کی کتاب کو حاصل کرو اور اس سے تمسک اختیار کرو ، پیغمبر اکرم ﷺ نے اللہ کی کتاب پر عمل کرنے کی تاکید کی اس کے بعد فرمایا : اور میرے اہل بیتؑ،میں تمھیں اپنے اہلبیتؑ کے لئے خدا کی یاد دلاتا ہوں (یہ جملہ آپؐ نے تین بار فرمایا)اس متن کو مسلم[1] نے اپنی صحیح میں اور دارمی نے اپنی سنن[2] میں ذکر کیاہے اور دونوں کی سند آفتاب کی طرح روشن ہے ان سند میں ذرہ برابر بھی خدشہ نہیں ہے۔

---

[1] صحیح مسلم ،ج۴،۱۸،۳ نمبر ۲۴۰۸ چاپ عبد الباقی
[2] سنن دارمی ،ج۲ص۴۳۱۔۴۳۲

۲۔ ترمزی نے بھی اس متن کو ''عترتی اہل بیتی '' کے الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے۔حدیث کا متن یوں ہے '': انّی تارک فیکم ما ان تمسکتم بہ لن تضلوا بعدی ،احدھما اعظم من الاخر کتاب اللہ حبل ممدود من السماء الیٰ الارض و عترتی اہل بیتی لن یفترقا حتٰی یردا علیّ الحوض ،فانظروا کیف تخلفونی فیھا[1]''میں تمھارے درمیان دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں ،جب تک تم اس سے متمسک رہو گے ہر گز گمراہ نہیں ہوگے ان میں سے ایک دوسرے سے بزرگ ہے ۔ اللہ کی کتاب ریسمان رحمت جو آسمان سے زمین کی طرف آویزاں ہے ۔اور میری عترت و اہل بیتؑ ۔یہ دونوں ایک دوسرے سے ہر گز جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ حوض کوثر پر میرے پاس آجائیں ۔ اب دیکھو میری ان دونوں میراثوں کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہو۔

یہ دونوں متن کہ دونوں میں لفظ ''اہل بیت '' کی تاکید ملتی ہے اس سلسلہ میں جواب کے طور پر کافی ہیں دونوں کی سندوں میں کمال یقین پایا جاتا ہے اور اس میں کسی بحث کی ضرورت نہیں ہے ۔ دونوں حدیثی متن کے ناقل صحاح و سنن ہیں جو ایک خاص اعتبار رکھتے ہیں ۔ ''و سنتی ''کے متن کی سندوہ روایت جس میں ''اہل بیتی '' کے بجائے لفظ ''سنتی''آیا ہے ۔ جعلی حدیث ہے جو سند کے ضعف کے علاوہ امویوں سے وابستہ افراد کے ہوتھوں گڑھی ہوئی ہے ۔ ذیل میں ہم اس حدیث کی اسناد کا جائزہ لیتے ہیں:پہلی سند ،حاکم کی روایت: حاکم نیشاپوری نے اپنی ''مستدرک '' میں حسب ذیل سند کے ساتھ نقل کیا ہے:۱۔اسماعیل بن ابی اویس ۲۔ابی اویس ۳۔ثور بن زید الدیلمی

۴۔عکرمہ

۵۔ابن عباس کہ پیغمبر اکرم ﷺنے فرمایا '' :یا ایھا الناس انی قد ترکت فیکم ان اعتصمتم بہ فلن تضلوا ابدا کتاب اللہ و ستۃ نبیہ[2]'' اے لوگو!میں نے تمھارے درمیان دو چیزیں ترک کیں جب تک تم ان دونوں سے وابستہ رہو گے ہر گز گمراہ نہ ہوگے ۔ اللہ کی کتاب اور اس کے نبیؐ کی سنت۔اس متن کی سند کی مشکل اسماعیل بن ابی اویس اور ابو اویس ہیں۔ ان باپ اور بیٹوں کی نہ صرف توثیق نہیں

---

[1] سنن ترمذی ،ج۵ ص۶۶۳ نمبر ۳۷۷۸۸

[2] المستدرک ،حاکم ،ج۱ص۹۳

ہوئی ہے بلکہ ان پر جھوٹ اورحدیث گڑھنے کا الزام ہے ۔ اب ان کے بارے میں علمائے رجال کی آرا ء ملاحظہ فرمائیں:
حافظ مزی نے اپنی کتاب ''تہذیب الکمال '' میں اسماعیل اور اس کے باپ کے بارے میں رجال کے محققین کی زبانی یوں نقل کیا ہے:
یحییٰ بن معین (جو علم رجال کے بڑے عالم ہیں) کہتے ہیں ۔ابو اویس اور اس کا بیٹا ضعیف ہیں ، یحییٰ بن معین سے یہ بھی نقل ہے کہ یہ دونوں حدیث چراتے ہیں ۔

ابن معین نے اس کے بارے میں یہ بھی کہا ہے کہ : اس کی بات پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا ۔نسائی نے بیٹے کے بارے میں کہا ہے کہ : وہ ضعیف ہے اور ثقہ نہیں ہے ۔ ابو القاسم لالکائی نے کہا ہے کہ نسائی نے اس کے خلاف بہت کچھ کہا ہے ۔ یہاں تک کہ اس نے کہا ہے : اس کی حدیث کو ترک کر دینا چاہئے ۔رجال کے ایک عالم ابن عدی نے کہا ہے : ابن ابی اویس نے اپنے ماموں مالک سے مجہول حدیثیں نقل کی ہیں جنھیں کوئی قبول نہیں کرتا[1]۔ ابن حجر نے فتح الباری کے مقدمہ میں لکھا ہے : ابن ابی اویس کی حدیث کے ذریعہ ہر گز استدلال نہیں کیا جا سکتا ۔ کیوں کہ نسائی نے اس کی مذمت کی ہے[2]۔ حافظ سید احمد بن الصدیق نے کتاب ''فتح الملک العلی '' میں سلمہ بن شبیب سے نقل کیا ہے کہ اس نے اسماعیل بن ابی اویس کو کہتے ہوئے سنا ہے : جب اہل مدینہ کسی موضوع کے بارے میں دو گروہوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں تو میں حدیث گڑھتا ہوں[3]۔ لہٰذا بیٹا (اسماعیل بن ابی اویس)وہ ہے جس پر حدیث گڑھنے کا الزام ہے اور ابن معین اسے جھوٹا کہتے ہیں مزید یہ کہ اس کی حدیث کسی بھی کتب صحاح میں نقل نہیں ہوئی ہے ۔اور باپ کے بارے میںیہی کہنا کافی ہے کہ ابو حاتم رازی نے کتاب '' جرح و تعدیل '' میں لکھا ہے : اس کی حدیث لکھی جاتی ہے لیکن اس کے ذریعہ احتجاج و استدلال نہیں کیا جاتا ۔ اور اس کی حدیث قوی و محکم نہیں ہے[4] ۔ نیز ابو حاتم نے ابن معین سے نقل کیا ہے کہ ابو اویس قابل اعتماد نہیں ہے۔ جو روایت ان دونوں کی سند کے ذریعہ بیان ہو ہر گز صحیح نہیں ہوگی ۔جب کہ یہ روایت صحیح و ثابت روایت کے مخالف و مقابل ہے۔ قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ حدیث کے ناقل یعنی حاکم نیشا پوری نے اس حدیث کے ضعیف ہونے کا اعتراف کیا ہے لہٰذا اس کی سند کی تصحیح

---

[1] حافظ مزی ،تہذیب الکمال ،ج۳ص۱۲۷
[2] ابن حجر عسقلانی مقدمہ فتح الباری ،ص۳۹۱طبع دار المعرفہ
[3] حافظ سید احمد ، فتح الملک العلی ص۱۵
[4] ابو حاتم رازی ، الجرح و التعدیل ج۵ص۹۲

نہیں کی ہے لیکن اس کے مفاد کی صحت پر گواہ لے آئے ہیں کہ وہ بھی سند کے اعتبار سے سست اور اعتبار کے درجہ سے ساقط ہے ۔ اس لئے حدیث کی تقویت کے بجائے اس کے ضعف میں اضافہ ہی ہوا ہے۔ وسنتی کی دوسری سند حاکم نیشاپوری نے ابو ہریرہ سے بطور مرفوع[1] نقل کیا ہے ''انّی قد ترکت فیکم شیئین لن تضلوا بعدھما :کتاب اللہ وسنتی ولن یفترقا حتٰی یردا علیّ الحوض[2]'' اس متن کو حاکم نے اس سند کے ذریعہ نقل کیاہے:

۱۔ الضبی،از

۲۔ صالح بن موسیٰ الطلحی،از

۳۔ عبد العزیز بن رفیع از

۴۔ ابی صالح ،از

۵۔ ابی ہریرہ.

یہ حدیث پہلی حدیث کی طرح جعلی ہے۔ اور اس کی سند کے درمیان صالح بن موسیٰ الطلحی پر انگلی رکھی جا سکتی ہے۔ اب ہم اس کے بارے میں علمائے علم رجال کے نظریات نقل کرتے ہیں: یحییٰ بن معین کا بیان ہے کہ صالح بن موسیٰ قابل اعتماد نہیں ہے۔ ابو حاتم رازی کا قول ہے کہ اس کی حدیث ضعیف اور منکر ہے۔ وہ بہت سی منکر حدیثوں کو ثقہ افراد کے نام سے نقل کرتا ہے ۔ نسائی کا بیان ہے کہ اس کی حدیث لکھی نہیں جاتی اور دوسری جگہ کہتے ہیں :اس کی حدیث متروک ہے[3]۔ ابن حجر ''تھذیب التھذیب ''میں لکھتے ہیں کہ ابن حبان نے کہاہے :صالح بن موسیٰ ثقہ افراد سے ایسی چیزیں منصوب کرتاہے جو ان کی باتیں نہیں لگتیں۔ اور آخر میں ابن حجر نے

---

[1] وہ حدیث جسے راوی معصوم سے نسبت نہ دے
[2] حاکم،مستدرک ج۱ ، ص۹۳
[3] حافظ مزی، تہذیب الکمال،ج۱۳،ص ۹۶

لکھا ہے کہ : اس کی حدیث حجت نہیں ہے ،اور ابو نعیم کہتے ہیں کہ:اس کی حدیث متروک ہے وہ ہمیشہ منکر حدیث نقل کرتا ہے[1]۔ ایک دوسری جگہ ابن حجر کتاب تقریب[2] میں لکھتے ہیں :اس کی حدیث متروک ہے اور ذہبی،کتاب ''کاشف[3]''میں لکھتے ہیں :اس کی حدیث سست ہے۔آخر میں ذہبی نے ''میزان الاعتدال[4]''میں مذکورہ بالا حدیث کو نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کی حدیثیں منکر ہوتی ہیں۔حدیث ''وسنتی ''کی تیسری سند:ابن عبد البر نے کتاب ''تمہید[5]''میں اس متن کو حسب ذیل سند کے ساتھ ذکر کیا ہے:

۱۔عبد الرحمان بن یحییٰ ۔از

۲۔احمد بن سعید ۔از

۳۔ محمد بن ابراہیم الدبیلی۔از

۴۔علی بن زید الفرائضی۔از

۵۔الحنینی۔از

۶۔کثیر بن عبداللہ بن عمرو بن عوف ۔از

۷۔اس کے باپ نے اس کے دادا سے ہم ان راویوں کے درمیان کثیر بن عبد اللہ پر انگلی رکھتے ہیں۔امام شافعی لکھتے ہیں :وہ جھوٹ کے ارکان میں سے ایک ہے[6]۔ ابو داود کا بیان ہے:وہ کذابوں اور بڑے جھوٹوں میں سے ہے[7]؛ ابن حبان کہتے ہیں :عبداللہ بن کثیر نے اپنے باپ اور دادا سے حدیث کی کتاب نقل کی ہے جس کی بنیاد جعلی حدیثوں پر ہے کہ اس کتاب سے نقل کرنا اور عبداللہ سے

---

[1] تہذیب التہذیب،ابن حجر ،ج۴،ص۳۵۵
[2] تقریب،ابن حجر ،ترجمہ نمبر ۲۸۹۱
[3] کاشف ،ذہبی،ترجمہ نمبر ۲۴۱۲
[4] میزان الاعتدال،ذہبی،ج۲،ص ۳۰۲
[5] التمہید:ج۲۴،ص۳۳۱
[6] تہذیب التہذیب ،ابن حجر ،ج۱ص۳۷۷،طبع دار الفکر۔تہذیب الکمال:ج۲۴،ص۱۳۸
[7] تہذیب التہذیب ،ابن حجر ،ج۱ص۳۷۷،طبع دار الفکر۔تہذیب الکمال:ج۲۴،ص۱۳۸

روایت کرنا حرام ہے اور فقط تعجیب وتنقید کے لئے اس کی روایت نقل کی جا سکتی ہے[1]۔نسائی اور دار قطنی کہتے ہیں :اس کی حدیث متروک ہے۔امام احمد بن حنبل کہتے ہیں کہ :وہ منکر الحدیث ہے اور قابل اعتماد نہیں ہے۔ابن معین نے بھی یہی بات اس کے بارے میں کہی ہے۔

ابن حجر کے اوپر تعجب ہے کہ انہوں نے کتاب ''التقریب'' میں اس کے حالات بیان کرتے ہوئے اسے صرف ضعیف لکھا ہے اور جن لوگوں نے اسے جھوٹا کہا ہے انھیں افراطی کہا ہے،جبکہ علم رجال کے پیشواؤں نے اسے جھوٹا اور جعل ساز قرار دیا ہے یہاں تک کہ ذہبی کہتے ہیں کہ :اس کی باتیں فضول وضعیف وبیکار ہیں۔

بغیر سند کی روایت:

امام مالک نے کتاب ''الموطا''میں اس روایت کو سند کے بغیر بطور مرسل نقل کیا ہے۔اور سب جانتے ہیں کہ ایسی حدیث کوئی اہمیت نہیں رکھتی[2]۔ مذکورہ بالا باتیں پوری طرح سے یہ بات ثابت کرتی ہیں کہ ''وسنتی''والی حدیث جھوٹے اور اموی دربار سے وابستہ راویوں کی جعلی اور گڑھی ہوئی حدیث ہے جو انہوں نے حدیث صحیح کے مقابلہ میں گڑھی ہے ۔لہٰذا مسجدوں کے اماموں،خطیبوں اور اہل منبر حضرات پر واجب ہے کہ جو حدیث حضرت رسول اکرمؐ سے وارد نہیں ہوئی ہے اسے ترک کردیں اور اس کے بجائے لوگوں کو صحیح حدیث سے آگاہ کریں ۔جس حدیث کو مسلم نے ''اہل بیتی''کے ساتھ اور ترمذی نے ''عترتی واہل بیتی''کے ساتھ نقل کیا ہے اسے بیان کریں ۔طالب علموں پر لازم ہے کہ علم حدیث کی طرف توجہ کریں اور صحیح وضعیف حدیث میں فرق کو سمجھیں۔آخر میں،میں یہ یاد دہانی کرانا چاہتا ہوں کہ لفظ ''اہل بیتی''میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذریت مثلاً حضرت فاطمہ وحسن وحسین علیہم السلام بھی داخل ہیں،کیونکہ مسلم نے اپنی صحیح[3] میں اور ترمذی نے اپنی سنن[4] میں خود ام المومنین عایشہ سے نقل کیا ہے کہ '':نزلت ھذہ الآیۃعلی النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ''انما

[1] المجروحین از ابن حبان،ج۲،ص۲۲۱
[2] الموطّا،امام مالک ،ص۸۸۹،حدیث نمبر۳
[3] صحیح مسلم ،ج۴ ص۱۸۸۳ نمبر ۲۴۲۴
[4] ترمذی ج۵ ص۶۶۳

یریداللہ لیذھب عنکم الرجس اہل البیت ویطھرکم تطھیرا ''،فی بیت ام سلمۃ،فدعاالنبیؐ فاطمۃ وحسناً وحسیناً فجللھم بکساء وعلی خلف ظھرہ فجللہ بکساء ثم قال:اللّٰھم ھٰؤلاء اھل بیتی فاذھب عنھم الرجس وطھرھم تطھیراً،قالت ام سلمۃ وانا معھم یا نبی اللہ؟قال انت علی مکانک وانت الی الخیر''آیت ''انما یریداللہ لیذھب عنکم الرجس اہل البیت ویطھرکم تطھیرا ''جناب ام سلمہ کے گھر میں نازل ہوئی پیغمبر اکرم ﷺ نے فاطمہ،حسن وحسین علیھم السلام کو کساء کے نیچے لے لیا۔

حضرت علی،آپ کی پشت پر کھڑے تھے آنحضرت نے ان پر بھی اپنی عبا اڑھائی اور فرمایا:پالنے والے یہ میرے اہل بیت ہیں ان سے ہر طرح کی برائیوں کو دور فرما اور انھیں ایسا پاک قرار دے جو پاک کرنے کا حق ہے ۔اس وقت جناب ام سلمہ نے کہا :اے رسول خدا ﷺ کیا میں بھی ان میں سے ہوں ؟پیغمبر ﷺ نے فرمایا:تم اپنی جگہ پر رہو(یعنی چادر کے نیچے نہ آؤ) تم راہ خیر پر ہو[1]۔یہ تو تھا اہل سنت کے عالم دین شیخ حسن بن علی سقاف کا برادران اہل سنت کو جواب ۔لیکن یہاں خود شیخ سقاف کے بیان کردہ ایک مسئلہ کو صاف کرنا چاہتا ہوں ۔انھوں نے آیت تطہیر میں ازواج پیغمبر اکرم ﷺ کے شامل ہونے کو تو مسلم بتایا ہے اور آیت کے مفاد کو وسیع کرکے اس میں پیغمبر اکرم ﷺ کی بیٹی اور ان کے دو صاحب زادوں کو شامل کرنے کی کوشش کی ہے ۔جب کہ خود جناب ام سلمہ کی روایت جسے صحیح مسلم اور سنن ترمذی نے نقل کیا ہے ان کے نظریہ کے خلاف گواہی دے رہی ہے ۔

اگر اہل بیت کے علاوہ ازواج پیغمبر اکرم ﷺ آیت تطہیر میں داخل ہوتیں تو جناب ام سلمہ کو کساء میں داخل ہونے سے روکا نہ جاتا اور یہ نہ کہا جاتا ''انت علیٰ مکانک''یعنی تم اپنی جگہ پر رہو ۔اور تم خیر پر ہو !!!اس کے علاوہ جو شخص بھی ازواج پیغمبر ﷺ کے سلسلہ میں قرآن کی آیات کا مطالعہ کرے گا اسے واضح طور سے یہ بات معلوم ہوجائے گی کہ ان کے بارے میں آیات کی زبان تنبیہ و شرزنش والی ہے ۔ایسے افراد آیت تطہیر کے مصداق اور رسول خدا ﷺ کی دعا میں شامل نہیں ہوسکتے ۔اس کی تفصیل ''تفسیر منشور جاوید [2]''میں ملاحظہ فرمائیں۔

---

[1] صحیح صفۃ صلاۃ النبی ؐ از حسن بن علی السقاف کے ص،۲۸۹تا ص،۲۹۴ سے ماخوذ

[2] منشور جاوید،ج،۵ص،۲۹۴

۲۔ پیغمبرؐ پر صلوات کیسے بھیجیں شیعہ اور اہل سنت کے درمیان اختلافی مسائل میں سے ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ وہ جب پیغمبرؐ پر صلوات بھیجتے ہیں تو اس میں ان کی آل کو شامل نہیں کرتے اور وہ ''صلی اللہ علیہ وسلم'' کہتے ہیں ۔ جب کہ شیعہ پیغمبر اکرم ﷺ پر صلوات بھیجتے وقت ان کی آلؑ کو بھی شامل کرتے ہیں اور آل کو ان پر عطف کرتے ہوئے کہتے ہیں ''صلی اللہ علیہ وآلہ'' ۔اب سوال یہ ہے کہ ان دو صورتوں میں سے کون سی صورت صحیح ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے معصوم رہبروں یعنی ائمہ علیہم السلام نے دوسری صورت کو صحیح جانا ہے اور ہمیشہ آنحضرتؐ کے ساتھ ان کی آلؑ کو بھی شامل کرتے ہیں ۔اب ذرا دیکھیں کہ اہل سنت کی روایات میں صلوات کی کیفیت کیا ہے ۔ اور ان کی روایتیں ان دونوں صورتوں میں سے کس کی تصدیق کرتی ہیں۔ پہلے ہم اس سوال کا مختصر جواب دے چکے ہیں اب یہاں روایت نقل کرتے ہیں '' :جب آیت (ان اللہ و ملائکتہ یصلون علی النبی یا ایھا الذین آمنوا صلوا علیہ و سلّموا تسلماً) سورۂ احزاب ۵۶'' نازل ہوئی تو اصحاب نے آنحضرتؐ سے دریافت کیا کہ آپ پر کس طرح صلوات بھیجیں؟آنحضرتؐ نے فرمایا : ''لا تصلوا علی الصلاۃ البتراء '' مجھ پر ناقص صلوات مت بھیجو۔ لوگوں نے پوچھا کیسے بھیجیں ؟فرمایا :کہو (اللّٰھم صلی علی محمد وآل محمد[1]) درود بھیجنے کے اعتبار سے آل محمدؐ کی حیثیت ایسی ہے کہ اہل سنت کے بعض فقہی مذاہب آل محمد پر پیغمبرؐ کے ساتھ صلوات بھیجنے کو لازم و واجب جانتے ہیں۔امام شافعی اس سلسلہ میں فرماتے ہیں: یااھل بیت رسول اللہ حبکم فرض من اللہ فی القرآن انزلہکفاکم فی عظیم القدر انکم من لم یصل علیکم لاصلاۃ لہ[2] اے رسول خدا کے اہل بیتؑ آپ کی محبت ایسا فریضہ ہے جو قرآن میں نازل کیا گیا ہے آپ کی عظمت وجلالت کیلئے اتنا ہی کافی ہے کہ جو شخص آپ پر صلوات نہ بھیجے اس کی نماز ہی نہیں ہے۔ایسی ہی روایت سیوطی کی کتاب ''الدر المنثور'' ج۵ سورۂ احزاب کی آیت نمبر ۵۶ کے ذیل میں وارد ہوئی ہے جسے سیوطی نے ''المصنف'' کے مؤلف عبد الرزاق ،ابن ابی شیبہ ،احمد بن حنبل ،امام بخاری ومسلم ،ابوداود،ترمذی،نسائی،ابن ماجہ اور ابن مردویہ سے نقل کیا ہے۔

---

[1] صواعق محرقہ ، چاپ دوم مکتبہ " القاہرہ" مصر باب ۱۱، فصل اول ص۱۴۶
[2] صواعق محرقہ،باب۱۱ ص ۱۴۸ ،اتحاف بشراوی ص۲۹ وغیرہ

شعری ترجمہ:

اے اہل بیتؑ آپ کی الفت خدا گواہ ہے فرض ہر بشر پہ خدا کی کتاب میں رفعت یہ ہے کہ جو نہ پڑھے آپ پر درود اس کی نماز ہی نہیں حق کی جناب میں (از مترجم) صحیح بخاری اہل سنت کے نزدیک قرآن مجید کے بعد سب سے معتبر اور صحیح کتاب مانی جاتی ہے۔اب ہم سورۂ احزاب کی تفسیر کے ذیل میں صحیح بخاری کی ایک حدیث کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کرتے ہیں: عبدالرحمان ابن ابی لیلی نقل کرتے ہیں کہ: کعب بن معجرہ نے مجھ سے ملاقات کی اور کہا: کیا تم پسند کرتے ہو کہ میں ایک حدیث تمہیں تحفہ کے طور پر پیش کروں،وہ حدیث یہ ہے کہ ایک روز پیغمبر اکرمؐ اپنے اصحاب کے پاس تشریف لائے۔ہم نے عرض کی: یارسول خدا!ہم نے آپ پر سلام کرنے کی کیفیت قرآن سے سیکھ لی اب بتائیے کہ آپ پر صلوات کیسے بھیجیں؟آنحضرتؐ نے فرمایا: ''اللّٰھم صل علیٰ محمد وآل محمد کما صلیت علیٰ ابراھیم وآل ابراھیم انک حمید مجید''[1] لہٰذا اسلامی ادب اور پیغمبر اسلامؐ کے حکم کی تعمیل کا تقاضا ہے کہ ہم آنحضرتؐ پر ناقص اور دم بریدہ صلوات نہ بھیجیں نیز آنحضرتؐ اور ان کی آل پاکؑ میں جدائی نہ پیدا کریں۔

تمام شد بحمد اللّٰہ والمنۃ وصلی اللّٰہ علی سیدنا محمد وآلہ الطاہرین خیر الائمۃ

۱۱؍ذیقعدہ ۱۴۲۴ھ بروز میلاد حضرت امام رضاؑ۔

[1] صحیح بخاری،کتاب تفسیر جزء ۶ ص۲۱۷ سورۂ احزاب

یکطرفہ فیصلہ نہ کریں

اسلام میں وہ تنہا خلیفہ، جو مہاجر و انصار کی قریب با اتفاق اکثریت سے منتخب ہوا، امیر المؤمنین علی علیہ السلام تھے ۔ اسلامی خلافت کی تاریخ میں یہ امر بالکل بے نظیر تھا اور اس کے بعد بھی اس کی کوئی مثال نظر نہیں آتی ۔اس دوران جب معاویہ (جس نے مدتوں پہلے شام میں اپنی بادشاہت اور مطلق العنانیت کی داغ بیل ڈالی تھی اور خاندان رسالت کے ساتھ دیرینہ اور عمیق بغض و عداوت رکھتا تھا) اس امر سے آگاہ ہوا کہ مہاجرین و انصار نے حضرت علی علیہ السلام کو خلیفہ منتخب کرلیا ہے، تو سخت برہم ہوا اور امامؑ سے بیعت کرنے کیلئے تیار نہ ہوا ۔ اس نے نہ صرف امامؑ کی بیعت کرنے سے انکار کیا بلکہ حضرتؑ پر حضرت عثمان کے قتل اور اس کے قاتلوں کی حمایت کی تہمت بھی لگادی! امامؑ، معاویہ کو خاموش کرنے اور اس کیلئے ہر قسم کے عذر کے راستوں کو مسدود کرنے کیلئے اپنے ایک خط میں اسے تحریر فرماتے ہیں کہ ''؛ وہی لوگ جنھوں نے ابوبکر، عمر اور عثمان کی بیعت کی تھی، میری بھی بیعت کرچکے ہیں، اگر ان کی خلافت کو اس لحاظ سے قابل احترام سمجھتے ہو کہ مہاجرین و انصار نے ان کی بیعت کی تھی تو یہ شرط میری خلافت میں بھی موجود ہے''۔

امامؑ کے خط کا متن:

''انہ بایعنی القوم الذین بایعوا أبابکر و عمر و عثمان علی ما بایعوھم علیہ فلم یکن للشاھد أن یختار و لا للغائب أن یرد و إنّما الشوریٰ للمھاجرین و الأنصار اجتمعوا علی رجل و سموہ إماما کان ذلک (للہ) رضا''[1]؛ ''جن افراد نے ابوبکر، عمر اور عثمان کی بیعت کی تھی، وہ میرے ساتھ بھی بیعت کرچکے ہیں اس صورت میں مدینہ میں حاضر شخص کو کسی اور کو امام منتخب کرنے اور مرکزِ شوریٰ سے دور کسی فرد کو ان کا نظریہ مسترد کرنے کا حق نہیں ہے ۔ شوریٰ کی رکنیت صرف مہاجر و انصار کا حق ہے۔ اگر انہوں نے کسی شخص کی قیادت و امامت پر اتفاق نظر کیا اور اسے امام کہا، تو یہ کام خدا کی رضا مندی کا باعث ہوگا۔امام علیہ السلام کے اس خط کا مقصد، معاویہ کو خاموش کرنے، اس کی ہر قسم کی بہانہ تراشی اور خود غرضی کا راستہ بند کرنے اور قرآن مجید کی اصطلاح میں ''مجادلۂ احسن'' کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ کیونکہ معاویہ شام میں

[1] نہج البلاغہ ، خط نمبر/۶۔

حضرت عمر اور اس کے بعد حضرت عثمان کی طرف سے مدتوں گورنر رہ چکا تھا اور انھیں خلیفۂ رسولؐ اور اپنے آپ کو ان کا نمائندہ جانتا تھا ۔ ان حضرات کی خلافت کا احترام اسی جہت سے تھا کہ وہ مہاجر و انصار کی طرف سے منتخب ہوئے تھے، اور بالکل یہی انتخاب واضح اور مکمل صورت میں امام علیہ السلام کے حق میں بھی انجام پایا تھا س لئے کوئی وجہ نہیں تھی کہ ایک کو قبول اور دوسرے کو مسترد کیا جائے۔ امام علیہ السلام نے قرآن مجید میں حکم شدہ مجادلۂ کے ذریعہ[1] اپنی خلافت کے بارے میں معاویہ کی مخالفت کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا '': جنھوں نے ابوبکر اور عمر و عثمان کی بیعت کی تھی، وہی میری بیعت بھی کرچکے ہیں، لہذا اب تم میری خلافت کو جائز کیوں نہیں سمجھتے ہو؟''

مجادلہ کی حقیقت اس کے سوا کچھ اور نہیں ہے کہ جس چیز کو مخالف مقدس اور محترم جانتا ہو اسے استدلال کی بنیاد قرار دیکر مخالف کو اسی کے اعتقاد کے ذریعہ شکست دی جائے۔ اس لحاظ سے، یہ خط ہرگز اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ امام علیہ السلام مہاجرین و انصار کی شوریٰ کے ذریعہ خلیفہ کے انتخاب کو سو فیصد صحیح جانتے تھے اور امامؑ کا عقیدہ بھی یہی تھا کہ خلیفہ کا انتخاب مہاجرین و انصار کی مشورت کے ذریعہ ہی انجام پانا چاہئے اور مسئلہ امامت ہرگز ایک انتصابیمسئلہ نہیں بلکہ انتخابی مسئلہ ہے۔

اگر امام علیہ السلام کا مقصد یہی ہوتا ، تو انہیں اپنے خط کو گذشتہ تین خلفاء کی بیعت کی گفتگو سے شروع نہیں کرنا چاہئے تھا ،بلکہ انہیں ان خلفاء کی خلافت کی طرف اشارہ کئے بغیر اپنی بات کویوں شروع کرنا چاہئے تھا '' : مہاجرین و انصار نے میری بیعت کی ہے اور جس شخص کی وہ بیعت کرلیں وہ لوگوں کا امام و پیشوا ہوگا'' یہ جو امام بعد والے جملوں میں فرماتے ہیں : ''فان اجتمعوا علی رجل و سموہ اماماً، کان ذلک (للہ) رضا''، تو یہ احتجاج بھی مخالف کے عقیدہ کی روشنی میں ہے اور کلمہ ''اللہ'' نہج البلاغہ کے صحیح نسخوں میں موجود نہیں ہے بلکہ مصر میں چھپے نسخوں میں بریکٹ کے اندر پایا جاتا ہے (اور یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ امامؑ کے خط میں اس کلمہ (اللہ) کے ہونے میں شک پایا جاتا ہے) حقیقت میں امامؑ فرماتے ہیں کہ : اگر مسلمان اپنے پیشوا کے انتخاب میں ایک فرد پر اتفاق کریں، تو ایسا کام پسندیدہ ہے، یعنی تم لوگوں کے عقیدہ کے مطابق یہ کام پسندیدہ اور رضا مندی کا باعث ہے اور یہی کام تو میرے بارے میں انجام پایا

---

[1] (وجادلهم بالتی هی احسن)(نحل/ ۱۲۵)

ہے ،اب کیوں میری بیعت کرنے میں مخالفت کرتے ہو؟سب سے پہلا شخص ، جس نے اس خطبہ سے اہل سنت کے نظریہ کو ثابت کرنے کے سلسلہ میں استدلال کیا ہے ، شارح نہج البلاغہ ،ابن ابی الحدید ،ہے ۔ اس نے اس خط میں اور نہج البلاغہ کے دیگر خطبوں میں موجود قرائن کے سلسلہ میں غفلت کے سبب اس سے اہل سنت کے نظریہ کی حقانیت پر استدلال کیا ہے اور امامؑ کے فرمائشات کو ایک سنجیدہ امر سمجھتے ہوئے اسے آپؑ کا عقیدہ تصور کیا ہے[1]۔ شیعہ علماء جب بھی اس خطبہ کی شرح پر پہنچتے ہیں تو انہوں نے وہی مطلب بیان کیا ہے جس کا ہم اوپر اشارہ کرچکے ۔ تعجب ہے کہ احمد کسروی نے اپنی بعض تحریروں میں اس خطبہ کو بنیاد بنا کر اسے شیعوں کے عقیدہ کے بے بنیاد ہونے کی دلیل قرار دیا ہے اور اس سے بڑھ کر تعجب ان لوگوں پر ہے جو ان دو افراد کی باتوں کو نیا روپ دیگر اسے دھوکہ کھانے والوں کے بازار میں ایک نئی چیز کے طور پر پیش کرتے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ ہر زمانے میں مذہب تشیع کے ایسے محافظ موجود ہوتے ہیں جو خودغرضوں کی سازشوں کا پردہ چاک کردیتے ہیں ۔

یک طرفہ فیصلہ نہ کریں!

کسی فیصلہ کیلئے خود سری سے کام نہیں لینا چاہئے اور ''نہج البلاغہ '' میں موجود امامؑ کے دوسرے ارشادات سے چشم پوشی نہیں کرنا چاہئے ، بلکہ امام علیہ السلام کے تمام بیانات سے استفادہ کرکے ایک نتیجہ اخذ کرنا چاہئے ۔ یہی امام جو اس خط میں لکھتے ہیں:
''جن لوگوں نے گذشتہ تین خلفا کی بیعت کی تھی ،انہوں نے میری بھی بیعت کی ہے اور

جب کبھی مہاجر و انصار کسی کی امامت کے بارے میں اتفاق رائے کا اظہار کریں ، تو وہ لوگوں کا پیشوا ہوگا اور کسی کو اس کی مخالفت کرنے کا حق نہیں ہے''۔خلافت خلفاء کے بارے میں خطبۂ شقشقیہ میں فرماتے ہیں '': خدا کی قسم !فرزند ابو قحافہ نے پیراہن خلافت کو کھینچ تان کر پہن لیا حالانکہ وہ میرے بارے میں اچھی طرح جانتا تھا خلافت کی چکی میرے وجود کے گرد گردش کرتی ہے اور میرا خلافت میں وہی مقام ہے جو چکی کے اندر اس کی کیل کا ہوتا ہے ۔ میں وہ (کوہ بلند) ہوں جس سے علوم و معارف کا سیلاب نیچے کی

---

[1] شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید ج ۱۴، ص ۳۶۔

طرف جاری ہے اور کسی کے وہم و خیال کا پرندہ بھی مجھ تک نھیں پہنچ سکتا ۔ لیکن میں نے جامۂ خلافت کو چھوڑ دیا اور اس سے پہلو تہی کرلی اور سوچنا شروع کیا کہ اپنے کٹے ہوئے ہاتھوں (کسی ناصر و مددگار کے بغیر) سے حملہ کروں یا اس سے بھیانک تیرگی پر صبر کرلوں ، جس میں سن رسیدہ بالکل ضعیف اور بچہ بوڑھا ہوجاتا ہے اور مؤمن اس میں رنجیدہ ہوتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنے پروردگار کے پاس پہنچ جاتا ہے مجھے اس اندھیر پر صبر ہی قرین عقل نظر آیا ۔ لہذا میں نے صبر کیا حالانکہ آنکھوں میں (غم و اندوہ کے تنکے کی) خلش تھی اور حلق میں (غم و رنج کی) ہڈی پھنسی ہوئی تھی ۔ میں اپنی میراث کو لٹتے دیکھ رہا تھا ، یہاں تک کہ پہلے (ابو بکر) نے اپنی راہ لی اور وہ اپنے بعد خلافت ابن خطاب کو دے گیا ۔ تعجب ہے کہ وہ زندگی میں تو خلافت سے سبکدوش ہونا چاہتا تھا ۔ لیکن اپنے مرنے کے بعد اس کی بنیاد دوسرے کیلئے استوار کرتا گیا ۔ ان دونوں نے خلافت کو دو پستانوں کے مانند آپس میں بانٹ لیا اس نے خلافت کو ایک سخت و درشت جگہ قرار دے دیا ۔

آپ نے مزید فرمایا ... '' : یہاں تک کہ دوسرا (عمر) بھی اپنی راہ لگا ، اور اس نے خلافت کا معاملہ ایک جماعت کے حوالے کردیا ۔ اور مجھے بھی اس جماعت کا ایک فرد قرار دیا ۔ اے اللہ ! میں تجھ سے اس شوریٰ کی تشکیل اور اس کے مشورہ سے پناہ مانگتا ہوں جبکہ انہوں نے مجھے بھی اس کا ہم ردیف قرار دے دیا .....''[1] امام علیہ السلام اپنے ایک خط میں اپنی مظلومیت اور آپ سے بیعت لینے کے طریقے پر سے پردہ اٹھاتے ہوئے معاویہ کے ایک خط کے جواب میں جس میں اس نے حضرت کو لکھا تھا کہ انہیں اونٹ کی ناک میں نکیل ڈال کر کھینچنے کی صورت میں ابوبکر کی بیعت کرنے کیلئے کھینچ کر لے گئے تھے لکھتے ہیں '' : تم نے لکھا تھا کہ : مجھے اونٹ کی ناک میں نکیل ڈالکر کھینچنے کی صورت میں بیعت کرنے کیلئے کھینچ کر لئے گئے تاکہ میں بیعت کروں ۔

خدا کی قسم تم نے چاہا کہ میری ملامت کرو لیکن اس کے بجائے تم میری ستائش کر گئے ہو اور مجھے رسوا کرنا چاہتے تھے لیکن خود رسوا ہوگئے ہو (کیونکہ تم میری مظلومیت کا واضح طور پر اعتراف کرگئے ہو) کیونکہ مسلمان کیلئے جب تک اس کے دین میں شک اور یقین

[1] شرح نہج البلاغہ ، ج۱ ، خطبہ شقشقیہ ۔

میں خلل نہ ہو مظلومیت اور ظلم و ستم سہنے میں کوئی عار نہیں ہے[1] ''کیا امام کی اپنی مظلومیت کے بارے میں اس صراحت کے باوجود کہ آپؑ سے زورزبردستی اور جبراً بیعت لی گئی ہے، یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ آپؑ نے خلفاء کی خلافت کی تائید کی ہوگی اور ان کو امت کے امام و پیشوا کے طور پر تسلیم کیا ہوگا؟ ہرگز نہیں، لہذا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ زیرِ بحث خط میں آپؑ کا مقصد مجادلہ اور طرف کو لاجواب کرنا تھا ۔ امام علیہ السلام اپنے ایک اور خط میں جسے آپؑ نے اپنے گورنر مالک کے ہاتھ مصر بھیجا تھا لکھتے ہیں '': خدا کی قسم! میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ عرب پیغمبرؐ کے بعد خلافت کو آپ کے خاندان سے نکال کر کسی دوسرے کو سونپ دیں گے اور ہمیں اس سے محروم کردیں گے ۔ ابوبکر کی بیعت کیلئے لوگوں کی پیشقدمی نے ہمیں رنج و مصیبت میں ڈالدیا[2] ''

پیغمبرؐ کی تشویش کہیں امت جاہلیت کی طرف پلٹ نہ جائے!

قرآن مجید کی آیات اور تاریخی قرائن اس امر کے شاہد ہیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اسلامی معاشرے کے مستقبل کے بارے میں سخت فکر مند تھے ۔ اور (غیبی الہامات سے قطع نظر) بعض سلسلہ وار ناگوار حوادث کو دیکھتے ہوئے آپؐ کے ذہن میں یہ احتمال تقویت پارہا تھا کہ ممکن ہے ایک گروہ یا بہت سے لوگ آپ کی رحلت کے بعد جاہلیت کے زمانے کی طرف پلٹ جائیں اور سنن الہی کو پس پشت ڈال دیں ۔اس احتمال اور خدشہ نے اس وقت آپؐ کے ذہن میں اور زیادہ قوت پائی جب آپؐ نے جنگ اُحد میں (جب دشمن کی طرف سے پیغمبر اسلامؐ کے قتل ہونے کی افواہ پھیلائی گئی تھی) اس بات کا عینی مشاہدہ کیا کہ مسلمانوں کی اکثریت نے بھاگ کر پہاڑوں اور دور دراز علاقوں میں پناہ لے لی ۔ اور بعض لوگوں نے فیصلہ کرلیا کہ منافقوں کے سردار '' عبداللہ ابن ابی '' کے ذریعہ ابو سفیان سے امان حاصل کریں ۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ان لوگوں کا مذہبی عقیدہ اتنا کمزور اور متزلزل ہوا تھا کہ وہ خدا کے بارے میں بدگمان ہو کر جاہلانہ افکار کے مرتکب ہوگئے تھے ۔ قرآن مجید نے اس راز کا یوں پردہ چاک کیا ہے: (وَ طَاۗىِٕفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ

---

[1] و قلت إنّی کنت اقاد کما یقاد الجمل المخشوش لا بایع ، و لعمر الله لقد أردت أن تذم فمدحت ، و أن تفضح فافتضحت و علی المسلم من غضاضۃ فی ان یکون مظلوماً ما لم یکن شاکاً فی دینہ و لا مرتاباً بیقینہ '' (نہج البلاغہ ، خط ۲۸)

[2] ''و لا یخطر ببالی انّ العرب تزعج ھذا الأمر من بعدہ صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم عن أھل بیتہ ولا انّھم منحوہ عنی من بعدہ فما راعنی إلا انثیال الناس علی فلان یبایعونہ.....'' (نہج البلاغہ ، خط ۶۲)

ظَنَّ الجَاهِلِيَّةِ يَقُولُونَ هَلْ لَنَا مِنَ الأَمْرِ شَيْءٍ[1]) (اصحاب پیغمبر میں سے ایک گروہ کو) اپنی جان کی اس قدر فکر تھی کہ وہ خدا کے بارے میں دور ان جاہلیت کے جیسے باطل خیالات کے مرتکب ہوگئے تھے اور وہ یہ کہہ رہے تھے کہ آیا (مسلمین پر حاکمیت) جیسی کوئی چیز ہم پر ہے ؟قرآن مجید ایک اور آیہ کریمہ میں اصحاب رسول خداؐ کے آپسی اختلافات کے بارے میں اشارتاً خبر دیتے ہوئے فرماتا ہے:

(وَ مَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَإِن مَاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ وَ مَن يَنْقَلِبْ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ فَلَن يَضُرَّ اللهَ شَيْئاً وَ سَيَجْزِي اللهُ الشَّاكِرِينَ[2]) ''اور محمدؐ تو صرف خدا کی جانب سے ایک رسول ہیں جن سے پہلے بہت سے رسول گذر چکے ہیں کیا اگر وہ مر جائیں یا قتل ہوجائیں تو تم الٹے پیر پلٹ جاؤ گے ؟تو جو بھی ایسا کرے گا وہ خدا کا کوئی نقصان نہیں کرے گا اور خدا عنقریب شکر گزاروں کو ان کی جزا دے گا ''۔یہ آیۂ شریفہ اصحاب رسول خداؐ کو دو حصوں یعنی عصر جاہلیت کی طرف لوٹ جانے والے اور ''ثابت قدم و شکر گزار ''گروہ میں تقسیم کر کے اشارتاً یہ بیان کرتی ہے کہ پیغمبر اسلامؐ کی رحلت کے بعد مسلمان افتراق و اختلاف کے شکار ہو کر دو گروہ میں بٹ جائیں گے ایک گروہ عصر جاہلیت کی طرف پلٹ جائے گا اور دوسرا گروہ ثابت قدم و شکر گذار رہے گا ۔

کیا عقل اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ پیغمبر اسلام ایک ایسی امت کو جو اختلاف و افتراق سے دو چار ہو ،اپنے حال پر چھوڑ دیں اور ان کیلئے ایک امام و پیشوا اور حاکم و فرمان روا مقرر نہ فرمائیں؟پیغمبر کیلئے یا قومی اتحاد کے قائل افراد کیلئے بھی یہ ہر گز جائز نہیں کہ ایک ایسے لوگوں کی اجتماعی و سیاسی زندگی کی باگ ڈور خود ان کے ہاتھ میں دیدیں ،بلکہ حالات پر قابو رکھنے کیلئے لازم بن جاتا ہے کہ ایک لائق اور قابل شخص کو امت کے امام و پیشوا کی حیثیت سے مقرر کیا جائے تا کہ حتی الامکان اختلاف و افتراق اور نا امنی سے معاشرے کو بچایا جا سکے ۔پیغمبر اسلام جانتے تھے کہ آپ کی امت میں اختلاف و افتراق پایا جاتا ہے اور یہ امت بھی گزشتہ امتوں کی طرح مختلف گروہوں میں بٹ جائے گی ،حتی آپ نے اپنی امت کے بارے میں پیشنگوئی کے ذریعہ فرمایا ہے '': ستفترق امتی علی ثلاث و سبعین فرقۃ، فرقۃ ناجیۃ و الباقون فی النار ''عنقریب میری امت ۷۳ فرقوں میں بٹ جائے گی ان میں سے صرف ایک گروہ اہل نجات ہوگا اور باقی

---

[1] آل عمران /۱۵۴۔
[2] آل عمران : ۱۴۴

فرقے جہنمی ہوں گے[1]'' یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اطلاع و آگاہی رکھنے کے باوجود کہ امت کی رہبری کا انتخاب بہت سے اختلافات کا سد باب بن سکتا ہے کس طرح اس اہم امر کو ایک متلون مزاج جمعیت کے سپرد کیا، جس کے نتیجہ میں امت میں یہ وسیع اختلافات و شگاف پیدا ہوگیا ؟! اسلامی سماج، ان دنوں مختلف گروہوں میں بٹ گیا تھا اور ہر گروہ ایک آرزو اور مقصد رکھتا تھا: انصار دو معروف گروہوں یعنی ''اوس'' و ''خزرج'' پر مشتمل تھے، اور مہاجر، بنی ہاشم اور بنی امیہ کے علاوہ قبائل ''تیم'' اور ''عدی'' پر مشتمل تھے۔

ہر گروہ چاہتا تھا معاشرے کی قیادت اس کے ہاتھ میں آجائے اور ان کے قبیلہ کا سردار اس عہدہ کا مالک بنے۔ کیا ان متضاد گروہوں کے ہوتے ہوئے امت میں اتحاد و یکجہتی اور دین کے سلسلے میں مسلمانوں کے استحکام و پائیداری کی امید کی جاسکتی ہے یا سب سے پہلے اختلاف و افتراق کے اسباب کو جڑ سے اکھاڑ دینا چاہیے تب ایسی امید رکھنی چاہئے ؟پیغمبر اسلامؐ کی رحلت کے بعد مسلمانوں کی صفوں میں جو سب سے بڑی دراڑ پیدا ہوئی اور جس سے ان کے اتحاد و یکجہتی پر کاری ضرب لگی وہ اسلامی قیادت کے بارے میں اختلاف نظر کا سبب تھا۔

اگر مسلمان اس موضوع پر اختلاف و افتراق کے شکار نہ ہوتے تو بہت سے اختلافات قیادت کے مسئلہ میں اتفاق نظر اور اتحاد کی وجہ سے حل ہوجاتے۔ لیکن اسی اہم اور بنیادی امر پر اختلاف ہی بعد والے اختلافات، جنگوں اور فتنوں کا سبب بنا نتیجہ کے طور پر امت مختلف گروہوں اور جماعتوں میں تقسیم ہوگئی اور بعض گروہ ایک دوسرے کی مخالفت اور ٹکراؤ پر اتر آئے۔

اہل سقیفہ کی منطق:

قرآن مجید یاران پیغمبرؐ کو تنبیہ کرتا ہے کہ مبادا آپؐ کی رحلت کے بعد وہ زمانہ جاہلیت کے افکار کی طرف پلٹ جائیں۔ سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہوئے گروہ کی سرگزشت کی تحقیقات اور مطالعہ سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح اس دن پوشیدہ اسرار اور کینہ و عداوت سے

---

[1] صحیح ابن ماجہ، باب فتن و غیرہ۔

پردے اٹھ گئے اور اصحاب رسولؐ کی گفتگو میں ایک بار پھر قومی اور قبیلہ ای تعصبات اور جاہلیت کے افکار رونما ہوئے اور واضح ہوگیا کہ اسلامی تربیت نے ابھی بہت سے اصحاب رسولؐ کے دلوں کی گہرائیوں تک رسوخ نہیں کیا تھا اور اسلام، جاہلیت کے منحوس چہرے پر ایک نقاب کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ اس تاریخی واقعہ کے مطالعہ اور تحقیق سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ اس اجتماع کا مقصد کیا تھا، جھگڑالوں تقریروں، ایک دوسرے پر حملوں کا مقصد ذاتی منفعت طلبی اور سود جوئی کے سوا کچھ نہ تھا۔ ہر شخص خلافت کا لباس شائستہ ترین شخص کو پہنانے کے بجائے اپنے بدن پر زیب تن کرنے کی کوشش میں تھا، اور جو موضوع اس مجلس میں زیر بحث نہ آیا وہ اسلام اور مسلمانوں کی مصلحت عامہ یا اس منصب کیلئے ایک شائستہ ترین فرد کی تلاش کرنا تھا، جو عقلمندانہ تدبیر، وسیع علم، عظیم روح اور پسندیدہ اخلاق سے اسلام کی ڈوبتی کشتی کو ساحل تک پہنچانے میں قیادت کے فرائض انجام دیتا۔ حادثۂ سقیفہ کے مطالعہ و تجزیہ سے بخوبی پتا چلتا ہے کہ سقیفہ کے ہدایت کار اپنے اور اپنے منافع کے علاوہ کوئی اور فکر نہیں رکھتے تھے اور ہر شخص اپنا الو سیدھا کرنے کی فکر میں تھا۔

تاریخی المیہ!

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا جسد اطہر ابھی زمین پر تھا، بنی ہاشم اور آنحضرتؐ کے بعض سچے اصحاب، پیغمبر اسلامؐ کی تجہیز و تکفین کے مقدمات میں مصروف تھے کہ اچانک انصار کا گروہ پیغمبر اسلامؐ کے گھر سے چند قدم کی دوری پر ''سقیفہ بنی ساعدہ'' نام کے ایک سائبان کے نیچے جمع ہوا تا کہ پیغمبر اکرمؐ کا خلیفہ و جانشین مقرر کرے۔ گویا ان لوگوں کی نظر میں خلیفہ کا تقرر پیغمبر اسلامؐ کی تجہیز و تکفین و تدفین سے انتہائی فوری اور اہم مسئلہ تھا جس وقت حضرت علی علیہ السلام بنی ہاشم اور مہاجرین کے ایک گروہ کے ہمراہ گھر کے اندر اور اس کے باہر پیغمبر اسلامؐ کی نماز جنازہ اور تدفین کی تیاریوں میں مصروف تھے، اچانک حضرت عمر نے جو گھر کے باہر تھے، انصار کے سقیفہ میں جمع ہونے کی خبر سنی۔ کسی کے ذریعہ فوراً حضرت ابو بکر کو اطلاع دی کہ جتنی جلد ہو سکے گھر سے باہر آئے۔ حضرت ابوبکر حضرت عمر کے بلاوے کے سبب سے آگاہ نہ تھے اس لئے عذر خواہی کے ساتھ جواب دیا کہ: ''میں یہاں پر کام میں مصروف ہوں لیکن آخر کار حضرت عمر کے اصرار پر مجبور ہوکر گھر اور پیغمبرؐ کے جسد اطہر کو چھوڑ کر باہر آئے۔ جب وہ بھی حضرت

عمر کی طرح ماجرا سے آگاہ ہوئے توانہوں نے بھی سب کچھ چھوڑ کر سقیفہ کی راہ لی ۔دونوں سقیفہ کی طرف چلے اور ابو عبیدہ ابن جراح کو بھی اپنے ساتھ لئے گئے ۔اب ذرا غور سے طرفین کے مناظرہ اور استدلال کو سنیئے کہ یہ لوگ کس منطق کے تحت خود کو اور اپنے قبیلہ کو خلافت کیلئے دوسرے سے لائق و شائستہ سمجھتے تھے۔اس جلسہ میں انصار کے ترجمان سعد بن عبادہ اور حباب بن منذر تھے اور مہاجرین کی ترجمانی کا فریضہ ابوبکر ، عمر اور ابو عبیدہ انجام دے رہے تھے،آخر میں انصار کی طرف سے بھی دو افراد نے سعد بن عبادہ کے کام میں روڑے اٹکانے کیلئے تقریریں کی ۔ اب پورا قضیہ ملاحظہ ہو : سعد (انصار سے مخاطب ہوکر) :تم لوگ ایسی فضیلت اور برتری کے مالک ہو کہ دوسرے اس سے محروم ہیں،پیغمبر گرامیؐ نے سالہا سال اپنے لوگوں کو توحید کی دعوت دی، لیکن چند لوگوں کے علاوہ کوئی آپؐ پر ایمان نہ لایا اور وہ بھی آپؐ کا دفاع کرنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے۔

لیکن تم لوگ انصار !آنحضرتؐ پر ایمان لائے آنحضرتؐ اور آپؐ کے اصحاب کا دفاع کیا ۔ آپؐ کے دشمنوں سے جنگ لڑی جس کے نتیجہ میں لوگوں نے آپؐ کا دین قبول کیا ۔ یہ تم لوگوں کی تلواریں تھیں جس کی وجہ سے عرب آنحضرتؐ کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوئے ۔ جب پیغمبر اسلامؐ اس دنیا سے رخصت ہوئے تو تم لوگوں سے راضی اور پر امید تھے اس لحاظ سے ضروری ہے کہ امر خلافت کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لے لو کیونکہ تم لوگ اس امر میں تمام لوگوں سے شائستہ اور بہتر ہو[1] سعد کی منطق یہ تھی،چونکہ ہم نے پیغمبرؐ اور آپؐ کے اصحاب کو پناہ دی ہے،آپؐ اور آپؐ کے اصحاب کا دفاع کیا ہے اور آپؐ کے دشمنوں سے جنگ لڑی ہے اس لئے ہم قیادت کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لینے میں دوسروں سے سزاوار اور لائق ہیں ۔اب دیکھئے کہ اس کے مقابلے میں مہاجرین کی منطق کیا تھی؟حضرت ابوبکر :مہاجرین اولین گروہ ہیں جو دین پیغمبرؐ پر ایمان لائے اور اس فضیلت پر افتخار کرتے ہیں ۔ انہوں نے مشکلات اور سختیوں میں صبر و تحمل سے کام لیا ہے،افراد کی کمی پر نہیں ڈرے ہیں، دشمنوں کی اذیتوں کو برداشت کیا ہے اور آنحضرتؐ پر ایمان اور آپؐ کے دین سے منہ نہیں موڑا ۔ ہم ،آپ،انصار کے فضائل اور خدمات سے ہرگز انکار نہیں کرتے اور بے شک مہاجرین کے بعد دیگر لوگوں پر آپ فضیلت اور برتری رکھتے ہیں ۔ اس لئے قیادت و رہبری کی باگ ڈور مہاجرین کے ہاتھ اور وزارت آپ لوگوں کے ہاتھ

---

[1] الامامۃ و السیاسۃ ج ۱، ص ۵

میں ہوگی اور ہم حاکم ہوں گے اور آپ وزیر اور کوئی بھی کام آپ لوگوں کے مشورہ کے بغیر انجام نہیں پائے گا[1] مہاجرین کی برتری کا استدلال یہ تھا کہ وہ سب سے پہلے پیغمبرؐ پر ایمان لائے ہیں اور آپ کے دین کو قبول کیا ہے ۔ حباب بن منذر : اے جماعت انصار ! حکومت کی باگ ڈور کو اپنے ہاتھ میں لے لو۔ دوسرے لوگ تمہاری ہی قدرت کے سائے میں زندگی بسر کرتے ہیں اور کوئی تمہارے خلاف کوئی قدم اٹھانے کی جرأت نہیں کرسکتا تم لوگ صاحب قدرت ہو اور تعداد میں بھی زیادہ ہو۔ اپنی صفوں میں ہرگز اختلاف و تفرقہ پیدا نہ ہونے دو، اختلاف کی صورت میں تباہی اور بردباری کے سوا کوئی نتیجہ نہ ہوگا ۔ اگر مہاجرین نے اقتدار پر قبضہ کرنے پر اصرار کیا تو ہم مسئلہ کو ''دو امیر'' کے طریقے سے حل کریں گے اور ایک قائد اور حاکم ہم میں سے اور ایک حاکم ان میں سے مقرر ہوگا[2] اس مناظرہ میں انصار کی منطق افراد کی کثرت اور ان کے دھڑے کی طاقت پر منحصر ہے ۔

وہ اس لئے جب قبیلۂ خزرج کے سردار نے ''حباب'' سے یہ بات سنی تو انتہائی افسوس کے ساتھ بول اٹھا : ھذا اول الوھن، یہ تجویز ہماری کمزوری کی نشانی ہے کہتے ہیں چونکہ ہم طاقتور ہیں اس لئے حاکم ہم میں سے ہونا چاہئے ۔ حضرت عمر: ایک غلاف میں ہرگز دو تلواریں نہیں سما سکتی ہیں۔ خدا کی قسم عرب تم لوگوں کی فرمانروائی کے سامنے ہرگز تسلیم نہیں ہوں گے کیونکہ ان کا پیغمبرؐ آپ لوگوں میں سے نہیں ہے۔ لیکن اگر حکومت پیغمبرؐ کے کسی رشتہ دار کے ہاتھ آئے تو عرب کو اس پر اعتراض نہیں ہوگا ۔ کس کی جرأت ہے کہ اس حکومت کے بارے میں ہمارا مقابلہ کرے اور ہم سے لڑے جس کی داغ بیل حضرت محمدؐ نے ڈالی ہے، جب کہ ہم آپؐ کے رشتہ دار ہیں ۔ اس گفتگو میں حضرت عمر نے زمام حکومت کو ہاتھ میں لینے کا معیار پیغمبرؐ کے ساتھ اپنی رشتہ داری اور قرابت کو قرار دیا اور اس طرح مہاجر اور ان میں قبیلہ قریش کو خلافت کیلئے شائستہ و حقدار جتلایا ہے[3] ۔ ''حباب بن منذر'' نے ایک بار پھر انصار کی طاقت کا سہارا لیتے ہوئے کہا :اے انصار کی جماعت ! عمر اور اس کے ہم فکروں کی بات پر کان نہ دھرو وہ تم لوگوں سے قیادت اور فرمان روائی چھیننا چاہتے ہیں ۔ اگر انہوں نے ہماری بات نہ مانی تو ان سب کو اس سرزمین سے نکال باہر کرو تم لوگ اس کام (فرمانروائی) کیلئے

[1] الامامۃ و السیاسۃ ج ۱ ، ص ۵۔
[2] انصار نے دو امیروں کی تجویز پیش کرکے اپنے پیروں پر کلہاڑی ماری ۔ اس مقابلہ میں ایک قدم پیچھے ہٹے اور مہاجرین کے مقابلے میں اپنے ضعف و کمزوری کا اعتراف کیا
[3] آیندہ بحث میں اس سلسلے میں امیر المؤمنین کی تنقید بیان ہوگی

دوسرے لوگوں سے زیادہ شائستہ ہو ۔ تم ہی لوگوں کی تلواروں کی جھنکار کے نتیجہ میں لوگوں نے یہ دین قبول کیا ہے ۔ عمر : خدا تجھے موت دے حباب : خدا تجھے موت دے ۔ ابو عبیدہ نے گویا انصار کو ایک رشوت دیتے ہوئے مہاجرین کو حکومت دیئے جانے کی یوں تائید کی :اے انصار کی جماعت ! تم لوگ وہ پہلے افراد تھے جنھوں نے پیغمبر اسلام ؐکی حمایت اور مدد کی اب یہ ہرگز سزاوار نہیں ہے کہ تم ہی لوگ سب سے پہلے پیغمبر ؐکی سنت کو بھی بدل دو ۔یہاں پر انصار میں سے سعد بن عبادہ (جو خلافت کیلئے انصار میں سے تقریباً آدھے لوگوں کا امیدوار تھا)کا چچیرا بھائی بشیر بن سعد ،اٹھ کھڑا ہوا ،امید تھی وہ انصار کے حق میں بول کر قضیہ کو ختم کردے گا لیکن اس نے اس کے برخلاف ، سعد بن عبادہ کے ساتھ اپنی دیرینہ عداوت کی وجہ سے حضرت عمر کے استدالال کی تائید کی اور اپنے رشتہ داروں کی طرف مڑکر کہا : محمد ؐقریش میں سے ہیں اور آپ کے رشتہ دار خلافت کیلئے دوسروں سے اولیٰ اور شائستہ ہیں ، میں یہ ہرگز نہیں دیکھنا چاہتا کہ آپ لوگ اس مسئلے میں ان سے ٹکرائیں ۔

طرفین نے اپنی اپنی بات سنادی اور کوئی دوسرے کو مطمئن نہ کرسکا تو حضرت ابو بکر نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک تجربہ کار سیاستداں کی طرح ایک نئی تجویز پیش کی اور ایک قدم آگے بڑھاتے ہوئے یہ فیصلہ کیا کہ دو آدمیوں کو پیش کرے تا کہ لوگ ان دونوں میں سے ایک کی بیعت کرلیں ، خاص کر انہوں نے مشاہدہ کیا کہ انصار میں اتفاق رائے نہیں ہے اور بشیر بن سعد ، سعد بن عبادہ (قبیلۂ خزرج کے سردار) کا مخالف ہے ۔اس لئے ایک خاص انداز میں بحث و مباحثہ کو ختم کرتے ہوئے بولے '' :میری درخواست ہے کہ مہربانی کرکے اختلاف و تفرقہ سے پرہیز کیجئے میں آپ لوگوں کا خیر خواہ ہوں ، بہتر ہے بات کو مختصر کیجئے اور عمر و ابو عبیدہ میں سے کسی ایک کی بیعت کرلیجئے '' ،عمر و ابوعبیدہ دونوں نے کہا :ہمارے لئے ہرگز یہ مناسب نہیں ہے کہ آپ جیسی شخصیت کے ہوئے ہوئے حکومت و خلافت کی باگ ڈور ہم اپنے ہاتھ میں لے لیں ۔ مہاجرین میں سے کوئی بھی آپ کے برابر نہیں ہے ۔ آپ غار ثور میں پیغمبر ؐکے ہمنشین تھے ،آپ نے پیغمبر ؐکی جگہ پر نماز پڑھائی ہے اور آپ کی مالی حالت بھی بہتر ہے ، اپنے ہاتھ کو آگے بڑھائے تا کہ ہم آپ کی بیعت کریں ۔یہاں پر حضرت ابو بکر نے بلاکسی تکلف کے بغیر کچھ کہے اپنا ہاتھ پھیلادیا اور دل میں موجود راز سے پردہ اٹھادیا ، اور یہ بات

کھل گئی کہ عمر اور ابو عبیدہ کو آگے بڑھانے کا مقصد اپنے لئے راہ ہموار کرنے کے علاوہ کچھ اور نہ تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ عمر، ابو بکر کے ہاتھ پر بیعت کرے، بشیر بن سعد نے سبقت کی اور حضرت ابو بکر کے ہاتھ پر دوسروں سے پہلے بیعت کی۔ اس کے بعد عمر اور ابو عبیدہ نے بھی جانشین رسول کی حیثیت سے حضرت ابو بکر کی بیعت کی۔ اسی وقت گروہ انصار میں وہ گہری دراڑ پڑگئی جس کا امکان بشیر کی تقریر کے بعد پیدا ہو چکا تھا۔ اس طرح انصار کی ناکامی قطعی ہوگئی۔ حباب بن منذر، بشیر کی بیعت (جو خود انصار میں سے تھا) پر آگ بگولا ہوگیا اور فریاد بلند کرتے ہوئے بولا: بشیر! تم نے نمک حرامی کی اور اپنے چچیرے بھائی سے رشک کی بنا پر اسے حاکم بننے نہیں دیا۔ بشیر نے کہا: ہرگز ایسا نہیں ہے بلکہ میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ خدا نے جو حق گروہ مہاجر کیلئے مخصوص کیا تھا، اس پر جھگڑا برپا کروں۔ ''اسید بن حضیر'' قبیلۂ اوس کا سردار جس کے دل میں ابھی بھی خزرج کے سردار کی طرف سے کینہ تھا اٹھا اور اپنے قبیلہ سے مخاطب ہوکر بولا: اٹھو اور ابو بکر کی بیعت کرو، کیونکہ اگر سعد حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لے گا تو قبیلۂ خزرج ہم پر ایک قسم کی برتری پیدا کرلے گا اس پر قبیلہ اوس نے بھی اپنے سردار کے حکم سے حضرت ابو بکر کی بیعت کر لی۔

اس موقع پر سیدھے سادھے لوگوں کی جماعت جن میں فکری شعور نہیں پایا جاتا اور جو اپنے سردار کے حکم کی پیروی کرتے ہوئے حضرت ابو بکر کی بیعت کیلئے اس طرح آگے بڑھے کہ سعد قدموں تلے روند ڈالا گیا۔ ایک نامعلوم شخص نے پکارتے ہوئے کہا: خزرج کا سردار پیروں تلے روند ڈالا گیا! اس کا خیال کرو! لیکن حضرت عمر اس بے احترامی سے خوش ہوئے اور کہا: خدا اسے موت دے، کیونکہ ہمارے لئے ابو بکر کی بیعت سے بالاتر کوئی چیز نہیں ہے! خود حضرت عمر جب بعد میں سقیفہ کا ماجرا بیان کرتے تھے تو حضرت ابو بکر کے حق میں اپنی بیعت کی وضاحت یوں کرتے تھے: اگر ہم اس دن نتیجہ حاصل کئے بغیر جلسہ کو ترک دیتے تو ممکن تھا ہمارے چلے جانے کے بعد انصار اتفاق رائے پیدا کر لیتے اور اپنے لئے کسی قائد کا انتخاب کر لیتے۔ بالآخر سقیفہ کا جلسہ بیان شدہ صورت میں خلافت کیلئے حضرت ابو بکر کے انتخاب کے اوپر ختم ہوا اور حضرت ابو بکر مسجد رسولؐ کی طرف بڑھے جبکہ حضرت عمر، ابو عبیدہ اور قبیلہ اوس کا ایک گروہ انھیں اپنے درمیان میں لئے ہوئے تھا اور سعد بھی اپنے تمام ساتھیوں کے ہمراہ اپنے گھر کی طرف

روانہ ہوگیا[1] سقیفہ کے واقعہ کے بغور مطالعہ کے بعد اب مناسب ہے کہ اس کے قابل توجہ نکات اور اسے وجود میں لانے والوں کی منطق پر غور کیا جائے ۔ اس ''جلسہ '' کے قابل توجہ نکات کا خلاصہ ذیل کے چند امور میں کیا جا سکتا ہے: ا۔ قرآن مجید کا حکم ہے کہ مؤمن آپس میں جمع ہو کر اپنے مشکلات کی گتھیوں کو تبادلہ خیال کے ذریعہ سلجھائیں۔ اس کے اس گراں بہا حکم کا مقصد یہ ہے کہ عقلمند اور حق پسند لوگوں کی ایک جماعت ایک پر سکون جگہ پر جمع ہوں اور حقیقت پسندانہ نیز تعصب سے عاری غور و فکر کے ذریعہ زندگی کی راہ کو روشن کریں اور مسائل کو حل کریں۔کیا سقیفہ کے جلسہ میں ایسا رنگ ڈھنگ پایا جاتا تھا؟اور کیا حقیقت میں اسلامی معاشرے کے عقلا وہاں پر جمع ہوئے تھے کہ خلافت کی گتھی کو گفتگو کے ذریعہ حل کریں؟یا مطلب اس کے بالکل بر عکس تھا؟اس جلسہ میں مہاجرین میں سے صرف تین افراد حاضر تھے اور ان تین افراد نے دیگر مہاجرین کو اس امر سے مطلع نہیں کیا تھا کہ وہ یہ کام انجام دینے جارہے ہیں ۔ کیا ایسے جلسہ کو جس میں عالم اسلام کی عظیم شخصیتیں، جیسے علی،ابن ابیطالب، سلمان فارسی،ابوذر غفاری، مقداد ، حذیفہ ،ابی بن کعب، طلحہ و زبیر اور ان جیسی دسیوں شخصیتیں موجود نہ ہوں عالم اسلام کیلئے صلاح و مشورہ اور تبادلہ خیا کا جلسہ کہا جا سکتا ہے ؟

کیا یہ صحیح تھا کہ ایک ایسے اہم موضوع کے لئے ایک چھوٹی سی میٹینگ پر اکتفا کی جاتی جس میں چیخ وپکار اور داد و فریاد بلند کی گئی اور انصار کے امیدوار کو قدموں تلے کچل ڈالا گیا ؟!یا یہ کہ ایسے اہم موضوع کے بارے میں کئی جلسے منعقد کرنا ضروری تھا جن میں عالم اسلام کی اہم مدبر اور شائستہ شخصیتیں بیٹھ کر اس اہم مسئلہ پر صلاح مشورہ کریں اور بالآخر اتفاق نظریا اکثریت آراء سے مسلمانوں کا خلیفہ منتخب کیا جاتا ؟ اس جلد بازی کے ساتھ حضرت ابوبکر کو خلافت کیلئے منتخب کرنا اس قدر ناپختہ اور خلاف اصول تھا کہ،بعد میں خود حضرت عمر اس سلسلے میں کہتے تھے '':کانت بیعۃ ابی فلتۃ وقی اللّٰہ شرّھا فمن دعاکم الی مثلھا فاقتلوہ[2]'' ''یعنی خلافت کیلئے ابوبکر کا انتخاب ایک اتفاق سے زیادہ نہیں تھا او یہ کام صلاح ومشورہ اور تبادلہ خیال کی بنیاد پر انجام نہیں پایا ،اب جو کوئی بھی تم لوگوں کو ایسے کام کی دعوت دے،اسے قتل کرڈالو''

---

[1] حادثۂ سقیفہ کی تفصیلات کو تاریخ طبری ج۳،(حوادث سال یازدھم) اور الامامۃ و السیاسۃ ، ابن قتیبہ دینوری ج۱، اور شرح ابن ابی الحدید ج۲ ص ۲۲ ۔۶۰ سے نقل کیا گیا ہے ۔

[2] سیرہ ابن ھشام ، ج۴، ۳۰۸۔ ارشاد شیخ مفید ، ص ۲۶۰

۲۔ دوسرا قابل توجہ نکتہ خود اہل سقیفہ کی منطق ہے ۔گروہ مہاجر کا استدلال غالباً دو چیزوں کے گرد گھوم رہا تھا : ایک ان کا خدا و پیغمبر اسلامؐ پر ایمان لانے میں پیش قدم ہونا اور دوسرا پیغمبر اسلام سے ان کی قرابت و رشتہ داری!اگر ان کی برتری کا معیار یہی دو چیزیں تھیں تو خلافت کیلئے حضرت ابوبکر کو حضرت عمر و ابو عبیدہ کا ہی سہارا نہیں لینا چاہئے تھا،کیونکہ مدینہ میں اس وقت ایسے افراد بھی موجود تھے جو ان دو افراد سے بہت پہلے دین اور توحید پر ایمان لا چکے تھے اور پیغمبر اسلامؐ سے نزدیکی قرابت بھی رکھتے تھے۔امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے والے پہلے شخص تھے اور پیدائش کے دن سے ہی آپؐ کے دامن مبارک میں تربیت پائے ہوئے تھے اور رشتہ داری کے لحاظ سے بھی آپؐ کے چچیرے بھائی اور داماد تھے ۔

اس کے باوجود کس طرح ان تین افراد نے خلافت کی گیند کو ایک دوسرے کی طرف پاس دیتے ہوئے بالآخر اسے حضرت ابوبکر کے حوالے کر دیا؟! عمر نے ابوبکر کی برتری کی توجیہ ان کی دولت مندی ،غار ثور میں رسول اللہ کی ہمراہی ،اور پیغمبرؐ کی جگہ پر نماز پڑھنے کے ذریعھکی۔دولت مند ہونے کے بارے میں کیا کہا جائے ،یہ وہی ایام جاہلیت کی منطق ہے جب دولت اور ثروت کو برتی و فضیلت کا سبب جانتے تھے ۔

مشرکین کا ایک اعتراض یہی تھا کہ یہ قرآن مجید کیوں ایک دولتمند فرد پر نازل نہیں ہوا[1] اگر رسول خدا کے ساتھ غار ثور میں ہمسفر ہونا خلافت کیلئے شائستگی اور معیار ہوسکتا ہے تو امیرالمؤمنینؑ کو خلافت کیلئے اس سے بھی زیادہ شائستہ و حقدار ہونا چاہئے۔کیونکہ آپؑ شب ہجرت اپنی جان پر کھیل کر پیغمبر اسلامؐ کے بستره پر سوئے تھے مفسرین کا اتفاق ہے کہ درج ذیل آیت آپؑ کے بارے میں نازل ہوئی ہے:(وَ مِن النَّاسِ مَن یَشْرِی نَفْسَہُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰہِ وَاللّٰہُ رَءوفٌ بِالْعِبَادِ) اور لوگوں میں وہ بھی ہیں جو اپنے نفس کو مرضی پروردگار کے لئے بیچ ڈالتے ہیں اور اللہ اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے[2]۔آنحضرتؐ کی بیماری کے دوران پیغمبرؐ کی جگہ حضرت ابوبکر کا نماز پڑھانا ، بذات خود ایک نامشخص اور مبہم داستان ہے اور یہ بات ثابت ہی نہیں کہ وہ نماز پڑھانے میں کامیاب بھی ہوئے کہ نہیں؟!اور یہ کام پیغمبرؐ

[1] (قالوا لَوْ لَا نُزِّلَ ھٰذَا القُرْء انُ عَلٰی رَجُلٍ مِنَ الْقَرْیَتَیْنِ عَظِیمٍ) (زخرف / ۳۱) و نیز رجوع کریں اسراء /۹۰ ۔۹۱
[2] بقرہ / ۲۰۷۔

کی اجازت سے انجام پایا تھا یا ایک من مانی حرکت تھی اور پیغمبر کی بعض بیویوں کے اشارہ پر نماز میں پیغمبر کی جانشینی پر قبضہ کرنے کی کوشش تھی؟! (اس بحث کی تفصیل آیندہ فصلوں میں ملاحظہ فرمائیں)بہر حال اگر یہی امر امامت اسلامیہ کی خلافت کی شائستگی کیلئے دلیل ہو، تو پیغمبرؐ بارہا مسافرت کے وقت اپنی جانشینی کی ذمہ داری من جملہ نماز کی امامت بعض افراد کو سونپتے رہے ہیں ۔ ایسے افراد کا سراغ حیات پیغمبرؐ کی تاریخ میں ملتا ہے، یہ کیسے ممکن ہے کہ ان سب جانشینوں میں سے صرف ایک آدمی، وہ بھی صرف ایک نماز پڑھانے کی وجہ سے باقی لوگوں پر پیغمبر کی جانشینی کا حقدار بن جائے ؟

۳۔ شریعت کے اصول و فروع کا علم رکھنا ، اسلامی معاشرے کی تمام ضرورتوں سے باخبر ہونا اور گناہ و خطا سے پاک ہونا ، امامت و رسول خداؐ کی جانشینی کی دو بنیادی شرطیں ہیں، جبکہ سقیفہ کے جلسہ میں اگر کسی چیز پر گفتگو نہیں ہوئی تو وہ یہی دو موضوع تھے۔

کیا یہ مناسب نہیں تھا کہ یہ لوگ قومیت ، رشتہ داری اور دیگر بیہودہ معیاروں پر انحصار کرنے کے بجائے علم و دانش اور عصمت اور پاک دامنی کے موضوع کو معیار قرار دے کر اصحاب پیغمبرؐ میں سے امت کی زعامت کیلئے ایک ایسے شخص کا انتخاب کرتے جو دین کے اصول و فروع سے بخوبی واقف ہو اور ابتدائے زندگی سے اس لمحہ تک اس سے کوئی غلطی سرزد نہ ہوئی ہو ؟اس طرح خود خواہی کے بجائے اسلام اور مسلمانوں کی مصلحت کو مد نظر رکھا جاتا ؟

۴۔ ان دونوں گروہوں کے استدال کے طریقے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ پیغمبرؐ کی خلافت و جانشینی سے ظاہری حکومت اور لوگوں پر فرماں روائی کے علاوہ کوئی اور مقصد نہیں رکھتے تھے۔ انھوں نے پیغمبر اسلامؐ کے دیگر منصبوں سے چشم پوشی کر رکھی تھی اور ان کی طرف کوئی توجہ نہیں رکھتے تھے ۔ یہی وجہ تھی کہ انصار ،افراد کی کثرت اوراپنے قبیلہ کی طاقت پر ناز کرتے ہوئے اپنے کو دوسروں پر فضیلت دیتے اور حقدار سمجھتے تھے۔یہ صحیح ہے کہ پیغمبر اسلامؐ مسلمانوں کے حاکم اور فرماں روا تھے، لیکن آپؐ اس مقام و منزلت کے علاوہ کچھ دوسرے فضائل اور منصبوں کے بھی مالک تھے کہ مہاجر و انصار کے امیدوارں میں ان کا شائبہ تک نہیں ملتا تھا ۔ پیغمبر اسلامؐ شریعت کی تشریح کرنے والے ، اصول و فروع کو بیان کرنے والے ،اور گناہ و لغزش کے مقابلے میں معصوم تھے۔ ان افراد نے

پیغمبرؐ کی جانشینی کا انتخاب کرتے وقت پیغمبر اسلامؐ کی ان معنوی فضیلتوں کو کیسے نظر انداز کردیا جن کی وجہ سے آپؐ اسلامی معاشرہ میں برتر اور حکمراں قرار پائے تھے بلکہ اسے ظاہری و سیاسی حکومت کے زاویہ سے دیکھا جو عموماً دولت، قدرت اور قبائلی قرابت کی بنیادوں پر قائم ہوتی ہے ۔ اس غفلت یا تغافل کی وجہ واضح ہے، کیونکہ اگر اسلامی خلافت کو اس زاویہ سے دیکھتے تو انھیں اپنے آپ کو خلافت سے محروم کرنے کے سوا کوئی نتیجہ نہیں ملتا ۔ اس لئے کہ دین کے اصول و فروع سے ان کی آگاہی بہت محدود تھی، حتی حضرت ابوبکر کا مجوزہ امیدوار (حضرت عمر) سقیفہ کی میٹنگ سے تھوڑی ہی دیر پہلے پیغمبر اسلامؐ کی وفات کا منکر ہوچکا تھا اور اپنے ایک دوست کی زبانی قرآن مجید کی آیت[1] سننے کے بعد خاموش ہوا تھا ۔ اس کے علاوہ حکمرانی کے دوران اور اس سے پہلے بھی ان لوگوں کی بے شمار غلطیاں اور خطائیں کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں ۔ ان حالات کے پیش نظر کیسے ممکن تھا کہ وہ ایک ایسی حکومت کی داغ بیل ڈال سکیں جس کی بنیاد علم و دانش، تقویٰ و پرہیزگاری، معنوی کمالات اور عصمت پر مستحکم ہو؟!

اصحاب سقیفہ کی منطق پر امیر المؤمنین کا تجزیہ:

امیر المؤمنین علیہ السلام نے سقیفہ میں موجود مہاجرین و انصار کی منطق پر یوں تنقید فرمائی: جب ایک شخص نے امامؑ کی خدمت میں آکر سقیفہ کا ماجرا بیان کیا کہ: مہاجر و انصار کے دو گروہ اپنے آپ کو خلافت کا حقدار سمجھ رہے تھے تو علی علیہ السلام نے فرمایا: ا۔ (وَ مَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَإِن مَاتَ أَوْ قُتِلَ انقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ) ''تم نے انصار کو جواب کیوں نہ دیا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ہم سے کہا ہے کہ ہم ان کے نیک افراد کے ساتھ نیکی کریں اور ان کے خطاکاروں کی تقصیر معاف کردیں''۔ اس کے بعد امام علیہ السلام نے پوچھا: قریش کس اصول پر اپنے آپ کو خلافت کا حقدار سمجھتے تھے؟ اس شخص نے جواب دیا: وہ کہتے تھے ہمارا تعلق رسول خداؐ کے خاندان سے ہے اور ہمارا اور آپؐ کا قبیلہ ایک ہی ہے۔

[1] آل عمران ۱۴۴

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: انہوں نے درخت سے اپنے لئے استدلال کیا اور اس کے پھل اور میوہ کو ضایع و برباد کردیا ۔ اگر وہ اسی لحاظ سے خلافت کے حقدار ہیں تو وہ ایک درخت کی ٹہنیاں ہیں اور میں اس درخت کا پھل اور آنحضرتؐ کا چچیرا بھائی ہوں، پھر خلافت کا حقدار میں کیوں نہیں ہوں[1]

امیر المؤمنین کی خلافت کیلئے خود شائستہ ہونے کی منطق:

سقیفہ کا ماجرا انتہائی ناگفتہ بہ حالت میں اختتام کو پہنچا اور حضرت ابوبکر ایک فاتح کی حیثیت سے جلسہ سے باہر نکلے، کچھ لوگ انہیں اپنے گھیرے میں لئے ہوئے تھے اور لوگوں سے کہتے تھے: رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے خلیفہ کی بیعت کرواور بیعت کو عمومی بنانے کیلئے لوگوں کے ہاتھ پکڑ پکڑ کر حضرت ابوبکر کے ہاتھ پر رکھتے تھے۔ان ناگفتہ بہ حوادث کے تحت کہ یہاں پر ہم ان کی وضاحت کرنے سے قاصر ہیں، حضرت علیؑ کو مسجد میں لایا گیا تا کہ وہ بھی بیعت کریں ۔امام علیہ السلام نے خلافت کیلئے اپنی شائستگی اور سنت رسولؐ سے متعلق اپنے وسیع علم اور عدالت کی بنیادوں پر حکومت کرنے کی اپنی روحی توانائی و صلاحیت کے ذریعہ خلافت کیلئے اپنی لیاقت و شائستگی پر استدلال کرتے ہوئے فرمایا '' :اے گروہ مہاجر! جس حکومت کی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے بنیاد ڈالی ہے،اسے آنحضرت کے خاندان سے خارج کرکے اپنے گھروں میں نہ لے جاؤ ۔ خدا کی قسم ہم اہل بیت پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اس کے زیادہ حقدار ہیں ۔ ہمارے درمیان ایسے افراد موجود ہیں جو قرآن مجید کے مفاہیم کا مکمل علم رکھتے ہیں ۔

دین کے اصول اور فروع کو اچھی طرح جانتے ہیں ۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت سے اچھی طرح آگاہ ہیں،اور اسلامی سماج کو بخوبی ادارہ کرسکتے ہیں ۔ برائیوں کی روک تھام کر سکتے ہیں اور غنائم کو عادلانہ تقسیم کرسکتے ہیں ۔جب تک معاشرے میں ایسے افراد موجود ہیں دوسروں کی باری نہیں آتی ،ایسا شخص خاندان نبوتؐ سے باہر کہیں نہیں مل سکتا ۔ خبردار! ہویٰ و ہوس کے غلام نہ بنو کیونکہ اس طرح راہ خدا سے بھٹک جاؤ گے اور حق و حقیقت سے دور ہوجاؤ گے[2] شیعہ روایات کے مطابق،امیر المؤمنینؑ بنی ہاشم کے ایک

---

[1] ''احتجوا بالشجرة و اضاعوا الثمرة ''(نہج البلاغہ خطبہ ۶۴)

[2] الله الله یا معشر المہاجرین لا تخربوا سلطان محمّد فی العرب عن داره و قعر بیتہ الی دورکم و قعور بیوتکم و لا تدعوا أهلہ عن مقامہ فی الناس و حقّہ ، فو الله یا معشر المهاجرین لنحن أحق الناس بہ ، لأنا أهل البیت و نحن أحقّ بهذا الأمر منکم ما کان فینا القاری لکتاب الله، الفقیہ

گروہ کے ہمراہ حضرت ابوبکر کے پاس گئے اور خلافت کے لئے مذکورہ صورت میں قرآن و سنت سے متعلق اپنے علم، اسلام میں سبقت اور جہاد میں ثابت قدمی، بیان میں فصاحت و بلاغت، شہامت اور شجاعت کو دلائل کے طور پر پیش کرکے اپنی شائستگی کو ثابت کیا اور فرمایا ''میں پیغمبر اسلام کی حیات اور آپؐ کی وفات کے بعد منصب خلافت کا مستحق اور سزاوار ہوں، میں اسرار کا خزانہ اور علوم کا مخزن ہوں ۔ میں صدیق اکبر اور فاروق اعظم ہوں میں پہلا شخص ہوں جو پیغمبر پر ایمان لایا اس راہ میں آپ کی تصدیق کی ۔ میں مشرکین کے ساتھ جنگ و جہاد کے دوران سب سے زیادہ ثابت قدم، کتاب و سنت کیعلم سے سب سے زیادہ آگاہ، دین کے اصول و فروع سے سب سے زیادہ واقف، بیان میں سب سے زیادہ فصیح اور ناخوشگوار حالات میں سب سے زیادقوی اور بہادر فرد ہوں، تم لوگ اس وراثت میں میرے ساتھ جنگ و جدال پر کیوں اتر آئے ہو[1] ۔

اسی طرح امیر المؤمنینؑ اپنے ایک خطبہ میں خلافت کا حقدار ایسے شخص کو سمجھتے ہیں جو امت میں حکومت چلانے کیلئے سب سے بہادر حکم الٰہی کو سب سے زیادہ جاننے والا ہو'': ایھا الناس ان احق الناس بھذا الامر اقواھم علیہ و اعلمھم بامر اللہ فیہ فان شغب شاغب استعتب فان بی قوتل[2] ''یعنی اے لوگو! حکومت کیلئے سب سے شائستہ فرد وہ ہے جو، سماج کا نظام چلانے میں سب سے زیادہ طاقت ور اور حکم الہی کو جاننے میں سب سے زیادہ عالم ہو۔ اگر کوئی شخص فساد کو ہوا دے اور وہ حق کے سامنے تسلیم نہ ہو تو اس کی تنبیہ کی جائے گی اور اگر اپنی غلطی کو جاری رکھے تو قتل کیا جائے گا ۔یہ صرف حضرت علی علیہ السلام کی منطق نہیں ہے بلکہ آپؑ کے بعض مخالفین بھی جب بیدار ضمیر کے ساتھ بات کرتے ہیں تو خلافت کیلئے حضرت علیؑ کی شائستگی کا اعتراف کرتے ہیں کہ آپ کا حق چھین لیا گیا ۔ جب ابو عبیدہ جراح حضرت ابوبکر کی بیعت سے حضرت علی علیہ السلام کے انکار کے بارے میں آگاہ ہوئے تو امام علیہ السلام کی طرف رخ کرکے بولے '': حکمرانی کو ابوبکر کیلئے چھوڑ دیجئے، اگر آپ زندہ رہے اور طولانی عمر آپ کو نصیب ہوئی تو آپ حکمرانی کیلئے سب سے

فی دین اللہ ، العالم بسنن اللہ، المضطلع بأمر الرعیۃ ، المدافع عنھم الأُمور السیءّۃ . القسم بینھم با لسویۃ، و اللہ انّہ لفینا ، فلا تتبعو الھوی فتضلوا عن سبیل اللہ فتزدادوا من الحقّ بعداً '' (الامامۃ و السیاسۃ ، ابن قتیبہ دینوری ، ج۱ ، ص ۱۲ ، احتجاج طبرسی ، ج۱ ، ص ۹۶)

[1] أنا أولی برسول اللہ حیاً و میّتاً و أنا وصیّہ و وزیرہ و مستودع سرّہ و علمہ ، و أنا الصّدیق الأکبر و الفاروق الأعظم، أوّل من آمن بہ و صدّقہ ، وأحسنکم بلاءً فی جھاد المشرکین، و أعرفکم بالکتاب و السنۃ ، أفقھکم فی الدین و اعلمکم بعواقب الأمور و أذر بکم لساناً و أثبتکم جناناً فعلام تنازعو فی ھذا الأمر (احتجاج طبرسی ، ج ۱۲ ، ص ۹۵)

[2] نہج البلاغہ، عبدہ ، خطبہ ۱۶۸۔

شائستہ ہیں کیونکہ آپ کی فضیلت ، قوی ایمان ، وسیع علم ، حقیقت پسندی ، اسلام قبول کرنے میں پیش قدمی اور پیغمبر اسلام کے ساتھ آپ کی قرابت کسی سے پوشیدہ نہیں ہے[1] پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بعد امت کی قیادت کا موضوع گزشتہ چودہ صدیوں سے عقائد اور مذاہب کے علماء اور دانشوروں کے درمیان مسلسل مورد بحث قرار پاتا رہا ہے، لیکن آج تک ایک محقق بھی ایسا پیدا نہیں ہوا جو یہ توجیہ کرے کہ حضرت ابو بکر کی خلافت پیغمبر اسلامؐ کی نص کے مطابق عمل میں آئی ہے اور یہ کہے کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے حضرت ابو بکر کی خلافت کے بارے میں اپنی حیات میں لوگوں کو وصیت کی تھی۔

حضرت ابو بکر کی خلافت کے بارے میں سنی علماء کے تمام دلائل مہاجرین و انصار کی بیعت اور خلافت پر اتفاق نظر تک محدود ہیں اور یہ امر کہ حضرت ابو بکر کی خلافت پیغمبر اکرمؐ کی نص کے مطابق نہیں تھی، یہ بات خود سقیفہ میں حضرت ابو بکر اور ان کے ہمفکروں کے بیانات سے بالکل ظاہر اور واضح ہوجاتی ہے ۔ اگر حضرت ابو بکر کی خلافت کے بارے میں پیغمبرؐ کی طرف سے کوئی نص موجود ہوتی تو وہ خود سقیفہ میں حضرت عمر اور ابو عبیدہ کا ہاتھ پکڑ کر ہرگز یہ نہ کہتے کہ : ''قد رضیت لکم هذین الرجلین'' میں ان دو افراد کو خلافت کیلئے صالح اور شائستہ جانتا ہوں اور ان دونوں کے انتخاب پرراضی ہوں۔اس کے علاوہ اگر حضرت ابو بکر کی خلافت کے سلسلے میں کوئی الٰہی نص موجود ہوتی، تو سقیفہ میں قریش کی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے قرابت اور ان کی اسلام میں سبقت کے ذریعہ استدلال نہیں کیا جاتا اور ان کے دوست و ہم فکر کبھی حضرت ابو بکر کے پیغمبرؐ کے ساتھ غار ثور میں ہم سفر ہونے اور نماز میں پیغمبرؐ کی جانشینی جیسے مسائل سے اپنے استدلال کو تقویت نہ بخشتے۔

خود حضرت ابو بکر نے سقیفہ کے دن انصار کے امیدوار کی تنقید کرتے ہوئے کہا '':ان العرب لا تعرف هذا الامر الّا القریش اوسط العرب داراً و نسباً ''، عرب معاشرہ قریش کے علاوہ جو حسب و نسب کے لحاظ سے دوسروں پر برتری رکھتے ہیں کسی کو خلافت کیلئے شائستہ نہیں جانتا ۔اگر حضرت ابو بکر کی خلافت کے حق میں رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے ایک لفظ بھی بیان ہوا ہوتا تو ان کمزور دلائل سے استدلال کرنے کے بجائے اس کا سہارا لیکر خود حضرت ابو بکر کہتے : اے لوگو!پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فلاں

[1] الامامة و السیاسة، ج ۱ ص ۱۲

سال اور فلاں روز مجھے مسلمانوں کے پیشوا اور خلیفہ کے طور پر منتخب کیا ہے۔یہ کیسے کہا جاسکتا کہ حضرت ابو بکر کی خلافت کو پیغمبرؐ نے معین فرمایا ہے جب کہ وہ خود بیماری کی حالت میں تمنا کرتے تھے،کہ کاش میں نے پیغمبر اسلامؐ سےیہ پوچھ لیا ہوتا کہ ''امت کی قیادت'' کا حقدار کون ہے؟عالم اسلام کے مشہور مؤرخ، طبری اس واقعہ کو تفصیل سے بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں '': جب ابو بکر بیمار ہوئے اور قریش کا ایک معروف سرمایہ دار عبد الرحمان بن عوف ان کی عیادت کیلئے آیا تومقدماتی گفتگو کے بعد ابو بکر نے انتہائی افسوس کے ساتھ لوگوں کی طرف رخ کرکے کہا : میری تکلیف کی پہلی وجہ وہ تین چیزیں ہیں جن کو میں نے انجام دیا ہے، کاش میں نے انہیں انجام نہ دیا ہوتا !اور تین چیزیں اور ہیں کہ کاش میں نے ان کے بارے میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے سوال کیا ہوتا ۔وہ تین چیزیں جنہیں کاش میں نے انجام نہ دیا ہوتا حسب ذیل ہیں: ١۔ کاش فاطمہؑ کا گھر نہ کھلوایا ہوتا چاہے جنگ و جدال کی نوبت آجاتی

٢۔ کاش میں نے سقیفہ کے دن خلافت کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر نہ لی ہوتی اور اسے عمر یا ابو عبیدہ کے سپرد کرکے خود وزیر و مشیر کے عہدہ پر رہتا ۔

٣۔ کاش ایاس بن عبد اللہ کو جو راہزنی کرتا تھا ،آگ میں جلانے کے بجائے تلوار سے قتل کرتا ۔اور وہ تین چیزیں جن کے بارے میں کاش میں نے پیغمبر اکرمؐ سے پوچھ لیا ہوتا یہ ہیں:

١۔ کاش میں نے پوچھ لیا ہوتا کہ خلافت و قیادت کا حقدار کون ہے ؟اور خلافت کا لباس کس کے بدن کے مطابق ہے؟

٢۔ کاش میں سوال کرلیا ہوتا کہ کیا اس سلسلے میں انصار کا کوئی حق بنتا ہے؟

٣ کاش میں نے پھوپھی اور بہن کی بیٹی کی میراث کے بارے میں پیغمبر اسلامؐ سے دریافت کرلیا ہوتا ![1]

[1] تاریخ طبری ،ج٣ ، ص ٢٣٤ ۔

نماز میں حضرت ابو بکر کی جانشینی:

اہل سنت کے بعض علماء اور دانشوروں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی بیماری کے دوران نماز میں حضرت ابو بکر کی جانشینی کے موضوع کو بڑی شد و مد سے نقل کیا ہے اور اسے ایک بڑی فضیلت یا خلافت کے لئے سند شمار کرکے یہ کہنا چاہا کہ جب پیغمبرؐ نماز میں ان کی جانشینی پر راضی ہوں تو لوگوں کو ان کی خلافت اور حکمرانی پر اور بھی زیادہ راضی ہونا چاہئے جو ایک دنیوی امر ہے۔

جواب: یہ استدلال کئی جہتوں سے قابل رد ہے: ا۔ تاریخی لحاظ سے کسی بھی صورت میں ثابت نہیں ہے کہ نماز میں حضرت ابو بکر کی جانشینی پیغمبرؐ کی اجازت سے انجام پائی ہو۔ بعید نہیں ہے کہ انہوں نے خود یا کسی کے اشارہ پر یہ کام انجام دیا ہو۔ اس امر کی تائید اس واقعہ سے ہوتی ہے کہ حضرت ابو بکر نے ایک بار اور پیغمبرؐ کی اجازت کے بغیر آپؐ کی جگہ کھڑے ہوکر نماز کی امامت خود شروع کردی تھی اہل سنت کے مشہور محدث امام بخاری اپنی صحیح میں نقل کرتے ہیں: ایک دن پیغمبرؐ قبیلہ بنی عمرو بن عوف کی طرف گئے تھے۔ نماز کا وقت ہوگیا ابو بکر پیغمبرؐ کی جگہ پر کھڑے ہوگئے اور نماز کی امامت شروع کردی جب پیغمبرؐ مسجد میں پہنچے اور دیکھا کہ نماز شروع ہوچکی ہے تو نماز کی صفوں کو چیرتے ہوئے محراب تک پہنچ گئے اور نماز کی امامت خود سنبھال لی اور ابو بکر پیچھے ہٹ کر بعد والی صف میں کھڑے ہوئے[1]

۲۔ اگر ہم فرض کرلیں کہ حضرت ابو بکر نے پیغمبرؐ کے حکم سے آپؐ کی جگہ پر نماز پڑھائی ہوگی تو نماز میں امامت کرنا ہرگز حکومت اور خلافت جیسی انتہائی اہم ذمہ داری کی صلاحیت کیلئے دلیل نہیں بن سکتا۔ نماز کی امامت کیلئے قرائت کے صحیح ہونے اور احکام نماز جاننے کے علاوہ کوئی اور چیز معتبر نہیں ہے (اور اہل سنت علماء کی نظر میں عدالت تک کی شرط نہیں ہے) لیکن خلافت اسلامیہ کے حاکم کیلئے سنگین شرائط ہیں جن میں سے کسی ایک شرط کو نماز کی امامت کیلئے ضروری نہیں سمجھا جاتا ہے، جیسے: اصول اور فروع دین پر مکمل دسترس اور کامل آگاہی رکھنا۔

[1] صحیح بخاری ج ۲، ص ۲۵۔

احکام اور حدود الٰہی کے تحت مسلمانوں کے امور کو چلانے کی پوری صلاحیت رکھنا ۔ گناہ اور خطا سے مبرّا ہونا اس استدلال سے پتا چلتا ہے کہ استدلال کرنے والے نے امامت کے منصب کو ایک معمولی منصب تصور کرلیا ہے اور اس سے پیغمبرؐ کی جانشینی کوایکعام حکمرانی کے سوا کچھ اور نہیں سمجھا ہے اسی لئے وہ کہتا ہے کہ : جب پیغمبرؐ نے ابو بکر کو دینی امر کیلئے منتخب کرلیا تو لازم اور ضروری ہے کہ ہم ان کی خلافت پر اور بھی زیادہ راضی ہوں، جو ایک دنیوی امر ہے۔اس جملہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کہنے والے نے اسلامی حکمرانی سے وہی معنی مراد لیا ہے جو دنیا کے عام حکمرانوں کے بارے میں تصور کیا جاتا ہے ۔ جبکہ پیغمبرؐ کا خلیفہ ظاہری حکومت اور مملکت کے امور کو چلانے کے علاو کچھ ایسے معنوی منصبوں اور اختیارات کا بھی مالک ہوتا ہے جو عام حکمراں میں نہیں پائے جاتے اور ہم اس سلسلے میں اس سے پہلے مختصر طور پر بحث کرچکے ہیں۔

۳۔ اگر نماز کیلئے حضرت ابو بکر کی امامت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے حکم سے انجام پائی تھی، تو پیغمبر اکرمؐ بخار اور ضعف کی حالت میں ایک ہاتھ کو حضرت علیؑ کے شانے پر اور دوسرے ہاتھ کو ''فضل بن عباس'' کے شانے پر رکھ کر مسجد میں کیوں داخل ہوئے اور حضرت ابو بکر کے آگے کھڑے ہوکر نماز کیوں پڑھائی؟پیغمبر کا یہ عمل امامت کیلئے حضرت ابو بکر کے تعین سے میل نہیں کھاتا۔اگر چہ اہل سنت علماء نماز میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی شرکت کی اس طرح توجیہ کرتے ہیں کہ حضرت ابو بکر نے پیغمبر اکرمؐ کی اقتداء کی اور لوگوں نے ابو بکر کی اقتداء کی ۔ اسی صورت میں نماز پڑھی گئی[1] واضح ہے کہ یہ توجیہ بہت بعید اور ناقابل قبول ہے، کیونکہ اگر یہی مقصود تھا تو کیا ضرورت تھی کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اس ضعف و بخار کی حالت میں اپنے چچیرے بھائیوں کا سہارا لیکر مسجد میں تشریف لاتے اور نماز کیلئے کھڑے ہوتے؟ بلکہ اس واقعہ کا صحیح تجزیہ یہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ اپنی اس کاروائی سے حضرت ابو بکر کی امامت کو توڑ کر خود امامت کرنا چاہتے تھے۔

۴۔ بعض روایتوں سے پتا چلتا کہ کہ نماز کیلئے حضرت ابو بکر کی امامت ایک سے زیادہ بار واقع ہوئی ہے اور ان سب کا پیغمبر کی اجازت سے ثابت کرنا بہت مشکل اور دشوار ہے کیونکہ پیغمبر اکرمؐ نے اپنے بیماری کے آغاز میں ہی اسامہ بن زید کے ہاتھ میں پرچم دیکر سب کو

---

[1] صحیح بخاری ، ج ۲، ص ۲۲۔

رومیوں سے جنگ پر جانے اور مدینہ ترک کرنے کا حکم دے دیا تھا ۔ اور لوگوں کے جانے پر اس قدر مصر تھے کہ مکرر فرماتے تھے: ''جہّزو جیش اسامۃ''اسامہ کے لشکر کو تیار کرو ۔ اور جو افراد اسامہ کے لشکر میں شامل ہونے سے انکار کررہے تھے،آپؐ ان پر لعنت بھیج کر خدا کی رحمت سے محروم ہونے کی دعا فرماتے تھے[1] ان حالات میں پیغمبرؐ ابوبکر کو امامت کے فرائض انجام دینے کی اجازت کیسے دیتے ؟!

۵ ۔ مؤرخین اور محدثین نے اقرار کیا ہے کہ جس وقت حضرت ابو بکر نماز کی امامت کرنا چاہتے تھے، پیغمبر اکرمؐ نے حضرت عائشہ ،ابو بکر کی بیٹی سے فرمایا '':فانکن صواحب یوسف ''،''تم مصر کی عورتوں کے مانند ہو جنھوں نے یوسفؑ کو اپنے گھیرے میں لے لیا تھا'' اب دیکھنا چاہئے کہ اس جملہ کا مفہوم کیا ہے، اور اس سے پیغمبرؐ کا مقصد کیا تھا؟یہ جملہ اس امر کی حکایت کرتا ہے کہ حضرت عائشہ پیغمبر اکرمؐ کی تنبیہ کے باوجود اسی طرح خیانت کی مرتکب ہوئی تھیں ، جس طرح مصر کی عورتیں خیانت کی مرتکب ہوئیں تھی اور زلیخا کو عزیز مصر سے خیانت کرنے پر آمادہ کرتی تھیں ۔ جس خیانت کے بارے میں یہاں پر تصور کیا جاسکتا ہے ،وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ حضرت عائشہ نے پیغمبر اکرمؐ کی اجازت کے بغیر اپنے باپ کو پیغام بھیجا تھا کہ پیغمبرؐ کی جگہ پر نماز پڑھائیں ۔

اہل سنت کے علماء ، پیغمبر اسلامؐ کے اس جملہ کی دوسرے انداز میں تفسیر کرتے ہیں اور کہتے ہیں: پیغمبرؐ اصرار فرماتے تھے کہ حضرت ابو بکر آپؐ کی جگہ پر نماز پڑھائیں ، لیکن حضرت عائشہ راضی نہیں تھیں ،کیونکہ وہ کہتی تھیں کہ لوگ اس عمل کو فال بد تصور کریں گے اور حضرت ابو بکر کی نمازمیں امامت کو پیغمبرؐ کی موت سے تعبیر کریں گے اور حضرت ابو بکر کو پیغمبرؐ کی موت کا پیغام لانے والا تصور کریں گے'' کیا یہ توجیہ پیغمبر اسلام کے عمل (مسجد میں حاضر ہوکر امامت کو سنبھالنے) سے میل کھاتی ہے؟!یہاں پر میں اپنی بات تمام کرتے ہوئے اس قضیہ کی صحیح نتیجہ گیری کا فیصلہ قارئین کرام پر چھوڑتا ہوں ۔اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں کے حاکم و فرماں روا ہونے کے ساتھ معنوی اور روحانی پیشوا بھی تھے ۔ قرآنی آیات ،اسلامی متون اور معتبر تاریخ اس امر کے شاہد ہیں کہ پیغمبر اسلامؐ نے مدینہ منورہ میں اپنے قیام کے ابتدائی لمحات سے اسلامی حکومت کی داغ بیل ڈالی اور حقیقی حکمرانی کی تمام ذمہ

[1] شرح نہج البلاغہ،ابن ابی الحدید ، ج ۶، ص ۵۲ ، نقل از : کتاب السقیفہ ، تالیف ابو بکر احمد بن عبد العزیز جوہری۔

داریاں اپنے کندھوں پر اٹھائیں اور اسلامی معاشرے کے بعض سیاسی، سماجی اور اقتصادی امور کو اپنی سرپرستی میں بعض شائستہ اور لائق افراد کو سونپا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خدا کی طرف سے فرماں روا اور حاکم ہونے کی بہت سی مثالیں ہیں یہاں ہم قارئین کرام کی توجہ کے لئے ذیل میں صرف چند مثالیں پیش کرتے ہیں : ۱۔ قرآن مجید پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو مسلمانوں کی جانوں سے اولیٰ قرار دیتے ہوئے فرماتا ہے : (النَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِینَ مِنْ اَنْفُسِھِمْ[1]) بیشک نبیؐ تمام مؤمنین پر ان کی جانوں سے زیادہ اولیٰ ہے

۲۔ قرآن مجید پیغمبر اکرمؐ کو حاکم و قاضی قرار دیتا ہے کہ مسلمانوں کے درمیان الٰہی قوانین کے تحت فیصلے کرے، چنانچہ اس سلسلے میں فرماتا ہے: (فَاحْکُمْ بَیْنَھُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰہُ وَ لَاتَتَّبِعْ اَھْوَآءَھُمْ[2]) ''آپ ان کے درمیان تنزیل خدا کے مطابق فیصلہ کریں اور خدا کی طرف سے آئے ہوئے حق سے الگ ہوکر ان کے خواہشات کا اتباع نہ کریں''

۳۔ پیغمبر اکرمؐ لوگوں میں نہ صرف خود فرماں روائی اور حکمیت کے فرائض انجام دیتے تھے بلکہ ہر علاقے کو فتح کرنے کے بعد، وہاں پر خود ایک شائستہ شخص کو بعنوان حاکم، دوسرے کو قاضی کی حیثیت سے اور تیسرے کو قرآن و احکام الٰہی کی تعلیم دینے کیلئے دینی معلم کی حیثیت سے مقرر فرماتے تھے اور بعض اوقات یہ تینوں عہدے ایک ہی فرد کو سونپتے تھے۔ پیغمبر اکرمؐ کے زمانے میں ہی امیر المؤمنین علی علیہ السلام عبد اللہ ابن مسعود، ابی ابن کعب اور زید بن ثابت وغیرہ قضاوت اور حکمیت کے فرائض انجام دیا کرتے تھے[3]۔ جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے مکہ اور یمن کو فتح کیا تو ''عتاب بن اسید'' کو مکہ کا گورنر اور ''بازان'' کو یمن کا حاکم منتخب فرمایا: کتاب ''التراتیب الاداریہ'' کے مؤلف ''عبد الحی کتانی'' نے اپنی کتاب میں ان مسلمان گورنروں کی فہرست ذکر کی ہے، جنہیں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اپنے زمانے میں مختلف علاقوں کے سماجی، سیاسی اور اقتصادی امور کی ذمہ داری سنبھالنے کیلئے منتخب فرمایا تھا ۔ اس کتاب کے مطالعہ سے پیغمبر اسلامؐ کے ذریعہ تشکیل دی گئی اسلامی حکومت کے طریقہ کار کا اشارہ ملتا ہ اسلام نے جہاد کی دعوت دے کر اور دینِ الٰہی کو پھیلانے کیلئے جہاد کے خصوصی قوانین بیان کئے اور مسلمانوں میں جنگی اور دفاعی تربیت

[1] احزاب /۶
[2] مائده /۴۸
[3] التراتیب الاداریۃ ، ج۱ ،ص ۲۸۵۔

کو وسیع پیمانے پر رائج کیا ۔ ساتھ ہی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ۲۷ جنگوں میں بذات خود حصہ لیا اور ۵۵ ''سریہ[1]''میں لشکر کے سردار معین کئے ۔ اس طرح سے اسلامی حکومت کا چہرہ لوگوں کے سامنے نمایاں فرمایا اور یہ ثابت کردیا کہ آپ ؐکی دعوت حضرت عیسی علیہ السلام کی دعوت کے مانند فقط روحانی، معنوی دعوت نہیں ہے آپ کی رہبری احکام بیان کرنے اور تبلیغ دین کے لئے صرف وعظ و نصیحت تک محدود نہیں ہے بلکہ آپ کی دعوت و معنوی رہنمائی ایک طاقتور حکومت کی تشکیل کے ہمراہ تھی تا کہ اپنے پیروؤں کو دشمنوں کے گزند سے محفوظ رکھ سکیں، کتاب خدا اور دین اسلام کو ان سے بچا سکیں اور یہ حکومت انسانی سماج میں الٰہی قوانین کے نفاذ کی ضامن بن سکے ۔اسلام کا اقتصادی نظام، حکومتی آمدنی، جیسے انفال وغیرہ اور عوامی آمدنی جیسے زکات و خمس وغیرہ اس امر کی واضح دلیل ہے کہ اسلام ایک جامع و کامل نظام ہے جس نے انسانوں کی سماجی زندگی کے تمام پہلوؤں میں ایک مکمل اور ہمہ گیر نظریہ پیش کیا ہے اور صرف محدود پیمانے پر خشک مذہبی مراسم ،وہ بھی ہفتہ میں ایک روز کی عبادت پر اکتفاء نہیں کیا ہے ۔

لیکن اس جملے کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ حقیقی عیسائی دین کی بنیاد یہی تھی ،بلکہ مسیحیت کے خود غرض مدعیوں نے قیصر و پاپ کے روپ میں دین مسیحیت کو رفتہ رفتہ اس صورت میں تبدیل کیا ہے اور حضرت عیسیؑ کے دین کو سماجی میدان سے خارج کرکے رکھ دیا ہے جب کہ بہت سے پیغمبر اس مقام و منصب کے مالک تھے ۔قرآن مجید بالکل واضح طور پر حضرت لوط اور حضرت یوسف علیہا السلام کے بارے میں کہتا ہے '': کہ ہم نے انھیں حکومت اور فرمان روائی دی[2]''خود حضرت یوسف بارگاہ الٰہی میں حمد و ثنا کرتے ہوئے فرماتے ہیں: (رَبِّ قَدْ آتَیْتَنِی مِنَ الْمُلْکِ)پروردگارا !تونے مجھے ملک عطا کیا[3] قرآن مجید نے حضرت داؤد کی قضاوت اور ان کی حکومت ،اور حضرت سلیمان و طالوت کی فرمان روائی اور حکومت کیلئے ان کی امتیازی حیثیتوں کا ذکر کیا ہے ۔ اس طرح پیغمبروں کو الٰہی حکومت کے بانی اور حکم الٰہی نافذ کرنے والوں کی حیثیت سے پہچنوایا ہے ۔امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے وسیع ابواب جو حکومت اسلامی کے نفاذ کی عملی بنیادوں میں سے ایک ہیں اور اسی طرح معاملات، حدود ، دیات اور فقہ کے دیگر ابواب کے تمام قوانین کے مطالعہ سے پیغمبر

---

[1] سریہ اس جنگ کو کہتے ہیں جس میں آنحضرت ؐ شامل نہ تھے۔
[2] انبیاء / ۷۲ ، یوسف / ۲۲۔
[3] یوسف / ۱۰۱

اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی طرف سے قائم کی گئی حکومت کا طریقہ کار ہر شخص کیلئے واضح و روشن ہوتا ہے ۔یہ مسئلہ اس قدر واضح ہے اور خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی زندگی اور خلفاء کی حکومت، خصوصاً امیر المؤمنین علی علیہ السلام کی الٰہی حکومت کے دور اس امر کے اتنے نمایاں گواہ ہیں کہ ہم اس سلسلے میں مزید وضاحت سے اپنے آپ کو بے نیاز سمجھتے ہیں ۔

بیان احکام اور لوگوں کی رہنمائی:

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم حکومت اور سیاسی فرمان روائی کے علاوہ احکام الٰہی کو بیان کرنے والے الٰہی قوانین کے مفسر اور قرآن مجید کی آیات کے اغراض و مقاصد بیان کرنے کے عہدہ دار بھی تھے ۔قرآن مجید آپؐ کو مندرجہ ذیل آیۂ شریفہ میں کتابِ خدا کے عالی مفاہیم بیان کرنے والے کی حیثیت سے پہنچوایا ہے: (وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ) اور آپ کی طرف ذکر (قرآن) کو نازل کیا ہے تا کہ لوگوں کیلئے ان احکام کو واضح کردیں جو ان کی طرف نازل کئے گئے ہیں[1] ۔

آیۂ شریفہ میں کلمۂ ''لِتُبَيِّنَ'' تا کہ آپ بیان کریں) سے واضح ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم قرآن مجید کی آیات کی تلاوت کے علاوہ اس امر پر بھی مأمور تھے کہ ان آیات کے مفاہیم اور مضامین کی وضاحت فرمائیں ۔ اگر آپؐ کا فریضہ صرف آیات الٰہی کو پڑھنا ہوتا تو کلمہ ''لِتُبَيِّنَ'' کے بجائے ''لِتَقْرَأَ'' یا ''لِتَتْلُوَ'' ہوتا ۔بیشک قرآن مجید کے حکم کے مطابق آنحضرتؐ کتابِ خدا اوراس کے حکیمانہ احکام کے معلّم ہیں،جیسا کہ فرماتا ہے: (هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ) ''اس خدا نے مکہ والوں میں ایک رسول بھیجا جو انھیں میں سے تھا کہ ان کے سامنے آیات کی تلاوت کرے ،ان کے نفوس کو پاکیزہ بنائے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے[2]'' پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اپنی زندگی کے دوران ان دو عہدوں (حاکمیت اور الٰہی احکام کے نفاذ) نیز احکام کی رہنمائی و تبلیغ پر فائز تھے اور یقیناآپؐ کی رحلت کے بعد بھی،اسلامی معاشرے کو ایک ایسے شخص کی ضرورت تھی جو ان دو منصبوں کا حامل ہو۔ اب ہمیں دیکھنا چاہئے کہ ان خصوصی شرائط کا حامل کون شخص ہے جو ان دو امور میں

[1] نحل /۴۴
[2] جمعہ /۲

معاشرے کی باگ ڈور سنبھال سکے؟واضح ہے کہ احکام بیان کرنا اور لوگوں کو حلال و حرام بتانا، اخلاقی فضائل اور ان کی فطری خوبیوں کی راہنمائی کرنا یعنی ایک جملہ میں یوں کہا جائے کہ : دینی رہبری اور معنوی امور کی قیادت کیلئے عصمت اور خطا و گناہ سے پاک ہونے اور وسیع علم کا مالک ہونے کی ضرورت ہے کیونکہ لوگوں پر مکمل قیادت، جس میں پیشوا کا قول و فعل لوگوں کے لئے ہادی و رہنما ہو، اس کی مکمل پرہیزگاری (جسے عصمت کہتے ہیں) اور وسیع علم پر منحصر ہے ۔ دوسرے الفاظ میں : اسلامی معاشرے کے قائد کو احکام اور اصول و فروع دین پر مکمل دسترس ہونی چاہیئے، اس کے بغیر وہ لوگوں کیلئے مکمل راہنما اور الٰہی رہبر نہیں بن سکتا، اگلے صفحات میں ہم ثابت کریں گے کہ ہمہ گیر رہبری و رہنمائی عصمت کے بغیر ممکن نہیں ہے ۔

قرآن مجید خدائے تعالیٰ کی طرف سے طالوت کو فرمان روائی کے عہدے کیلئے منتخب کرنے کا سبب دو چیزیں بیان فرماتا ہے:۱۔ علم و دانش میں برتری ۲۔ جسمانی لحاظ سے طاقتور ہونا، جس کی وجہ سے دن رات، وقت بے وقت قوم کیلئے کام کر سکے اور قیادت کی ذمہ داری سنبھال سکے (حکام کے لئے دوسری شرط زمانۂ قدیم سے تجربہ کے ذریعہ ثابت ہو چکی ہے، حتی یہ بات ضرب المثل بن گئی ہے کہ : صحیح عقل و فکر صحت مند بدن میں ہوتی ہے) اب یہ آیۂ شریفہ ملاحظہ ہو: (اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰہُ عَلَیْکُمْ وَ زَادَہٗ بَسْطَۃً فِی الْعِلْمِ وَ الْجِسْمِ) ''انہیں (طالوت کو) اللہ نے تمہارے لئے منتخب کیا ہے اور ان کے علم و جسم میں وسعت فرمائی ہے[1]''

امیر المؤمنین علیہ السلام جب اپنے سپاہیوں اور افسروں کو خطاب فرماتے تھے اور انہیں خدا کی راہ میں جہاد کرنے کی ترغیب و دعوت دیتے تھے تو اسلامی معاشرے کو ہر جہت سے ادارہ کرنے کی اپنی صلاحیت اور شائستگی بیان کرنے کیلئے اسی آیۂ شریفہ سے استدلال کرتے تھے اور فرماتے تھے: لوگو! اس قرآن مجید کی پیروی کرو اور اس سے نصیحت حاصل کرو جسے خدائے تعالیٰ نے اپنے پیغمبرؐ پر نازل کیا ہے ہم قرآن مجید میں پڑھتے ہیں کہ بنی اسرائیل کے ایک گروہ نے حضرت موسیٰؑ کی وفات کے بعد اپنے پیغمبر سے درخواست کی کہ خداوند عالم ان کیلئے ایک حاکم و فرماں روا منتخب کرے جس کی رہبری میں وہ خدا کی راہ میں جہاد کریں ۔ خدائے تعالیٰ نے حضرت طالوت کو ان کی فرماں روائی کیلئے منتخب فرمایا، لیکن بنی اسرائیل نے ان کی اطاعت نہیں کی، اور اس کام کیلئے ان کی

---

[1] بقره / ۲۴۷

صلاحیت اور شائستگی میں شک کرنے لگے ۔ خدائے تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو حکم دیا کہ ان لوگوں سے کہدو کہ اس منصب کیلئے طالوت کے انتخاب کا سبب علمی لحاظ سے ان کی برتری اور جسمی توانائی ہے۔ لوگوا !ان قرآنی آیات میں تم لوگوں کیلئے پند و عبرت پوشیدہ ہے ۔ خدا ئے تعالی نے اس لئے طالوت کو ان کیلئے حاکم اور فرمانروا قرار دیا تھا کہ وہ علم و جسمی توانائی میں ان سے برتر تھے اور وہ ان خصوصیات کی بنا پر جہاد و جد و جہد کر سکتے تھے[۱] حضرت امام حسن مجتبیٰؑ بھی اہل بیت رسولؐ کی خلافت و امامت کیلئے شائستگی ثابت کرنے کے لئے تمام الٰہی احکام اور امت کی تمام ضرورتوں کے بارے میں ان کے علم پر تکیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: لوگو!امت کے پیشوا ہمارے خاندان سے ہیں اور پیغمبرؐ کی جانشینی کی صلاحیت ہمارے علاوہ کوئی نہیں رکھتا ، خدا ئے تعالیٰ نے قرآن مجید میں اپنے پیغمبرؐ کے ذریعہ ہمیں اس منصب کیلئے شائستہ قرار دیا ہے ، کیونکہ علم و دانش ہمارے پاس ہے ، اور ہم قیامت تک رونما ہونے والے ہر حکم ، حتی بدن پر لگی ایک معمولی خراش کے حکم سے بھی آگاہ ہیں[۲]۔

دو منصب کو ایک دوسرے سے جدا کرنا صحیح نہیں :

حاکمیت کو معنوی قیادت کے منصب سے جدا کرنا ایسی چیز نہیں ہے جو اہل سنت علماء کی تازہ فکری پیداوار ہو بلکہ یہ بہت پرانی تاریخ ہے۔اس کی وضاحت یہ ہے کہ سقیفہ کا ماجرا ختم ہوا اور حضرت ابو بکر نے امور اپنے ہاتھ میں لئے اور ظاہراً حکومت کی باگ ڈور سنبھالی، رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابیوں میں ایک گروہ ایسا تھا ، جو امیر المؤمنین کو خلافت کے عہدے سے محروم کرنے پر سخت ناراض تھا ، کیونکہ جنگ تبوک[۳] کیلئے مدینہ سے باہر نکلتے وقت ۔ غدیر[۴] کے دن اور اپنی بیماری[۵] کے ایام میں پیغمبر اسلامؐ کے ارشادات بھی ان کے کانوں میں گونج رہے تھے ۔ اس لئے کچھ حق پسند افراد اس ڈرامائی انداز میں خلافت کے غصب کرنے پر سخت غصے میں

---

[۱] احتجاج طبرسی ، ج ۱، ص ۳۵۳ ، تلخیص کے ساتھ

[۲] ''ان الأئمۃ فینا و ان الخلافۃ لا تصلح الّا فینا و انّ اللہ جعلنا اہلہ فی کتابہ وسنۃ نبیہ و ان العلم فینا و نحن اہلہ و انہ لا یحدث شئ الی یوم القیامۃ حتی ارش الخدش الّا وھو عندنا'' (احتجاج طبری ، ج ۳ ص ۶)

[۳] جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تبوک کی جنگ پر جانے کا فیصلہ کیا تو، حضرت علی کو اپنا جانشین مقرر کرکے فرمایا'' انت منی بمنزلۃ ھارون من موسی الّا انہ لا نبی بعدی'' تم میرے لئے ویسے ہی ہو جیسے ہارون موسی کیلئے تھے ، فرق صرف یہ ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا ، پیغمبر اسلام نے اس جملہ سے ، نبوت کے علاوہ تمام منصبوں کو علیؑ کیلئے ثابت کردیا

[۴] حدیث غدیر کی تفصیل انیسویں فصل میں آئے گی ۔

[۵] یہاں مقصود حدیث ثقلین ہے کہ اس کے بارے میں بائیسوں فصل میں گفتگو آئے گی ۔

آئے، یہ لوگ کسی فریق کی طرفداری کئے بغیر خلیفہ کے پاس جاکر علیؑ کے بارے میں سوال کرتے تھے، خلیفہ اور اس کے ساتھیوں کے پاس اس کے سوا کوئی جواب نہیں تھا کہ دو منصبوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنا ضروری ہے وہ کہتے تھے کہ ''منصب حکومت اور معنوی قیادت ہرگز ایک ساتھ ایک خاندان میں جمع نہیں ہوسکتے'' رسول خدا کا ایک صحابی بریدہ بن خصیب، پیغمبرؐ کی رحلت کے وقت مدینہ سے باہر ماموریت پر گیا تھا ۔ وہ پیغمبرؐ کی رحلت کے بعد واپس مدینہ آیا اور اس نے حالات کو دگرگوں پایا، تو ایک پرچم حضرت علیؑ کے دروازے پر نصب کرکے غصہ کی حالت میں مسجد میں داخل ہوا اور خلیفہ اور ان کے ہمفکروں کے ساتھ بحث کرتے ہوئے کہنے لگا '': کیا تم لوگوں کو یاد نہیں ہے کہ ایک دن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہم سب کو حکم دیا تھا کہ حاکم اور امیر المؤمنین کی حیثیت سے حضرت علی علیہ السلام کو سلام کرو اور کہو: '' السلام علیک یا امیر المؤمنین اب کیا ہوا ہے کہ تم لوگ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وصیت اور سفارش کو فراموش کربیٹھے ؟خلیفہ نے ''بریدہ'' کے سوال کے جواب میں دونوں منصبوں کو جدا کرنے کا اپنا نظریہ بیان کرتے ہوئے کہا: خدائے تعالیٰ ہر دن ایک کام کے بعد دوسرا کام انجام دیتا ہے اور ایک خاندان میں نبوت (معنوی قیادت)اور حکمرانی کو جمع نہیں کرتا ۔

یعنی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیتؑ یا امت کے معنوی پیشوا ہوں گے تاکہ احکام و شریعت الٰہی کو بیان کریں یا حکمراں، یہ دونوں منصب ایک ساتھ جمع نہیں ہوسکتے ،خلیفہ کی بات پر ذرا دقت سے غور کریں ان کا مقصد یہ نظر نہیں آتا کہ یہ دو منصب ہرگز کبھی ا۔ پیغمبر نے اپنے اصحاب سے فرمایا: سلّموا علی علیّ بامرة المؤمنین ۔ایک ساتھ جمع نہیں ہوسکتے، کیونکہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان دونوں منصبوں کے مالک تھے۔ آپؐ مسلمانوں کے حاکم بھی تھے اور معنوی قائد بھی ۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ حضرت سلیمانؑ جیسے دوسرے پیغمبر بھی ان دونوں عہدوں پر فائز تھے ۔

یقیناًان کا مقصد یہ تھا کہ پیغمبرؐ کی رحلت کے بعد یہ دو مقام اور منصب آنحضرتؐ کے خاندان میں جمع نہیں ہوں گے، لیکن یہ نظریہ بھی گزشتہ نظریہ کی طرح باطل اور بے بنیاد ہے ۔ لہذا جب حضرت امام باقر علیہ السلام اصحاب سقیفہ کے اس نظریۂ ''جدائی'' کو نقل کرتے

تھے تو فوراً مندرجہ ذیل آیہ شریفہ ،جو فرزندان ابراہیم میں ان دونوں منصبوں کے جمع ہونے کی حکایت کرتی ہے سے اس نظریہ کو باطل قرار دیتے تھے ۔ (أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَىٰ مَا ءاتَٰهُمُ اللهُ مِن فَضْلِهِ فَقَدْ آتَيْنَا ءالَ إِبْرَاهِيمَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَآتَيْنَاهُم مُّلْكًا عَظِيمًا[1]) یا وہ ان لوگوں سے حسد کرتے ہیں جنہیں خدا نے اپنے فضل و کرم سے بہت کچھ عطا کیا ہے تو پھر ہم نے آل ابراہیم کو کتاب و حکمت اور ملک عظیم (بڑی فرمانروائی) سب کچھ عطا کیا ہے'' امام باقر علیہ السلام نے مذکور آیۂ شریفہ کی تلاوت کے بعد فرمایا '': فکیف یقرّون فی آل ابراھیم و ینکرونہ من آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ''پس یہ لوگ کس طرح ان دونوں منصبوں کے خاندان ابراہیمؑ میں جمع ہونے کا اعتراف کرتے ہیں، لیکن اسی چیز کے خاندان محمدؐ میں جمع ہونے کا انکار کرتے ہیں''

عیسائی تفکر:

حقیقت میں ان دونوں منصبوں کا ایک دوسرے سے جدا ہونا ،ایک قسم کا عیسائی تفکر ہے جو اس نظریہ کے ہمفکروں کی زبان پر جاری ہوا ہے ۔ کیونکہ یہ موجودہ تحریف شدہ عیسائی دین ہے جو یہ کہتا ہے کہ میں اس امر پر مأمور ہوں کہ امور قیصر کو خود قیصر کو سونپ دوں، لیکن دین اسلام کے تمام قوانین ایک مکمل مادی و معنوی ضابطہ حیات کی حکایت کرتے ہیں کہ جو بشر کی تمام سماجی، اخلاقی، سیاسی اور اقتصادی ضرورتوں کو پورا کرسکتا ہے ۔دین اسلام، جس کی بنیاد اور احکام و قوانین کے تانے بانے انسانی سیاست یعنی اسلامی سماج کے امور کی تدبیر کو تشکیل دیتے ہیں اس میں معنوی رہبری کو حکومت اور فرماں روائی سے جدا نہیں کیا جاسکتا ہے۔بیشک اسلام میں لوگوں پر حکومت و فرماں روائی بذات خود مقصد نہیں ہے بلکہ اسلامی حاکم اس لحاظ سے اس منصب کو قبول کرتا ہے کہ اس کے سائے میں حق کو زندہ کرسکے اور باطل کو نابود کرے ۔امیر المؤمنین علیہ السلام حکومت کو احیائے حق کا وسیلہ جاننے کے بجائے خود حکومت کو مقصد قرار دئیے جانے پر اعتراض کرتے ہوئے فرماتے ہیں '': و ان دنیاکم ھذہ ازھد عندی من عفطۃ عنز[2]''یعنی تم لوگوں کی دنیا اور یہ حکومت جس کیلئے ہاتھ پاؤں مار رہے ہو، میری نظر میں بکری کی ناک سے بہنے والے پانی کے برابر بھی قدر و قیمت نہیں رکھتے ۔

---

[1] نساء / ۵۴
[2] نہج البلاغہ ، خطبہ سوم

ماضی اور حال کے کچھ روشن خیال افراد یہ سوچتے ہیں کہ شیعہ و سنی کے درمیان اتحاد کا طریقہ یہ ہے کہ ان دو منصبوں کو خلفاء اور اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں تقسیم کردیا جائے، حکومت اور فرماں روائی کو خلفاء کا حق اور معنوی قیادت کو اہل بیت علیہم السلام کا حق جان لیں ۔ اس طرح اس چودہ سو سالہ جھگڑے کو ختم کردیں اور مسلمانوں کو مشرق و مغرب کی دو سامراجی طاقتوں کے خلاف متحد و طاقتور بنائیں۔ لیکن یہ نظریہ بھی غلط ہے کیونکہ اس طرح اس اتحاد کی بنیاد ایک غلط نظریہ پر قائم ہوگی جس سے ایک قسم کی عیسائیت اور سیکولرزم کی بو آتی ہے ۔

ہم قرآن مجید کے واضح حکم کے خلاف ان دو منبوں کو ایک دوسرے سے جدا کرکے اسے قربانی کے گوشت کی طرح کیوں تقسیم کریں ؟!مسلمانوں کے درمیاں اتحاد و یکجہتی کیلئے دوسرا راستہ موجود ہے اور وہ ایسے مشترکات ہیں جو دونوں فرقوں میں پائے جاتے ہیں ۔ کیونکہ سب ایک کتاب، ایک پیغمبر اور ایک قبلہ کی پیروی کرتے ہیں اور بہت سے اصول و فروع میں اتفاق نظر رکھتے ہیں، لہذا دوسرے مسائل میں اختلاف آپس میں ٹکراؤ اور خوں ریزی کا سبب نہیں ہونا چاہیے ۔

لیکن سیاسی اتحاد و یکجہتی کے تحفظ کے ساتھ ہر فرقہ کو اپنے عقائد کے صحیح اور منطقی دفاع کا پورا پورا حق ہونا چاہئے اور اپنے عقائد کے دفاع کے ساتھ ساتھ اپنے مشترک دشمن (سامراج اور صیہونزم) کے خلاف دیگر مسلمانوں کے ساتھ اتحاد و یکجہتی کی ضرورت کو فراموش نہ کرنا چاہئے ۔ گزشتہ گفتگو سے یہ پوری طرح ثابت ہوا کہ ایک مکمل مذہبی قیادت کیلئے دین کے اصول و فروع سے متعلق وسیع علم اور اسلامی معاشرہ کی ضرورتوں سے مکمل آگاہی ضروری ہے اور اس طرح کی مکمل آگاہی کے بغیر مذہبی قیادت ممکن نہیں ہے ۔ کیونکہ بشر کی تخلیق کا مقصد یہی ہے کہ وہ شریعت الٰہی پر عمل کرتے ہوئے اور ارتقاء و کمال تک پہنچنے اور پیغمبروں کے بھیجے جانے اور شرعی وقوانین کے نفاذ کا مقصد بھی اس کے سوا کچھ نہیں کہ انسان کو گمراہیوں سے بچا لیا جائے اور اسے کمالات و فضائل کی طرف رہنمائی کی جائے ۔ الٰہی قوانین پر عمل کرتے ہوئے ترقی کی منزلیں طے کرنا اس صورت میں ممکن ہے جب الٰہی فرائض و احکام بندوں کی دسترس میں ہوں تا کہ کمال کی راہ طے کرنے والوں کیلئے کوئی عذر و بہانہ باقی نہ رہے یا ان کی راہ سے رکاوٹیں دور کی جائیں ۔ تمام احکام تک رسائی حاصل کرنے

کیلئے شرط ہے کہ پیغمبر کے بعد لوگوں میں کوئی ایسا شخص موجود ہو جو سماج کی دینی ضرورتوں سے پوری طرح آگاہ ہو۔ تا کہ لوگوں کو ارتقاء و کمال کا راستہ اور صراط مستقیم دکھائے اور تخلیق کے مقاصد کو صحیح ثابت کرنے میں ذرا بھی غفلت سے کام نہ لے ۔ خلفائے ثلاثہ کی زندگی کا مطالعہ کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ ان میں سے کوئی ایک بھی ان خصوصیات کا حامل نہ تھا اور احکام و لوگوں کی دینی ضروریات کے بارے میں ان کے معلومات بہت ضعیف تھے۔ قرآن مجید کے بعد اسلامی معاشرہ کو ارتقاء بخشنے کا واحد راستہ سنن و احادیث پیغمبرؐ سے آگاہی ہے کہ ان کا اعتبار اور حجیت تمام مسلمانوں کی نظر میں مسلّم ہے ۔ قرآن مجید نے بھی بہت سی آیات میں سنّت اور احادیث پیغمبرؐ پر عمل کو ضروری قرار دیا ہے مثال کے طور پر درج ذیل آیۂ شریفہ ملاحظہ ہو: (مَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَ مَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا[1]) جو رسولؐ تمھیں دے اسے لے لو اور جس چیز سے منع کردے اس سے رک جاؤ''،لیکن مذکورہ خلفاء اسلامی احکام کے بارے میں کوئی نمایاں آگاہی نہیں رکھتے تھے اور ان ناقص اور معمولی معلومات کے ذریعہ انسانی قافلہ کو ہرگز کمال کی منزل تک نہیں پہنچایا جاسکتا ہے، جس کیلئے خود اسلامی احکام پر عمل پیرا ہونا لازم ہے۔

احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں جو روایتیں حضرت ابوبکر سے نقل کی ہیں ان کی کل تعداد ۸۰ احادیث سے زیادہ نہیں ہے[2] جلال الدین سیوطی نے انتہائی کوشش کرکے ان کی تعداد ۱۰۴ تک پہنچائی ہے[3] سر انجام حضرت ابوبکر سے نقل کی گئی روایتوں کی آخری تعداد ۱۴۲ بتائی گئی ہے[4] ان میں سے بھی بعض روایتیں نہیں ہیں بلکہ یہ باتیں ہیں جو ان سے نقل کی گئی ہیں مثلا ایک حدیث جو ان سے نقل کی گئی ہے اور انہی ۱۴۲ احادیث میں شمار ہوتی ہے یہ جملہ ہے '': ان رسول اللہ اھدی جملاً لأبی جھل ''یعنی پیغمبر نے ابو جہل کو ایک اونٹ ہدیہ کے طور پر دیا'' اس کے علاوہ ان سے نقل کی گئی کئی احادیث قرآن مجید اور عقل کے منافی ہیں مثلاً درج ذیل دو حدیثیں ملاحظہ ہوں:

۱۔ ''ان المیت ینضح علیہ حمیم ببکاء الحی''یعنی،زندہ لوگوں کے رونے سے مردے پر گرم پانی ڈالا جاتا ہے ۔واضح ہے کہ اس حدیث کا مضمون چند لحاظ سے مردود ہے: اولاً: میت پر معقول رونا ،انسانی جذبات کی علامت ہے اور پیغمبر اکرمؐ نے اپنے بیٹے حضرت ابراہیمؑ

[1] حشر / ۷۔
[2] مسند احمد ، ج ۱، ۲۔۱۴۔
[3] تاریخ الخلفاء ، ص ۵۹ ۔ ۶۶۔
[4] الغدیر ج ۷ ص ۱۰۸

کے سوگ میں شدت سے آنسو بہائے تھے اور فرماتے تھے '': پیارے ابراہیم ! ہم تیرے لئے کچھ نہیں کر سکتے، تقدیر الٰہی ٹالی نہیں جاسکتی، تیری موت پر تیرے باپ کی آنکھیں اشک بار ہیں اور اس کا دل محزون ہے، لیکن میں ہرگز ایسی بات زبان پر جاری نہیں کروں گا قہر خدا کا سبب بنے[1] ۔ جب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ''جنگ مؤتہ '' میں '' جعفر ابن ابو طالب ''کی شہادت کی خبر سے آگاہ ہوئے، تو آپ اس قدر روئے کہ آپ کی ریش مبارک پر آنسو جاری ہوگئے تھے[2] دوسرے یہ کہ ہم فرض بھی کرلیں کہ اس قسم کا رونا صحیح نہ ہوگا، تو آخر کسی ایک کے عمل سے دوسرا کیوں عذاب میں مبتلا کیا جائے گا ۔ قرآن مجید فرماتا ہے: (وَ لاَ تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِزْرَ اُخْرَیٰ[3]) اور کوئی شخص دوسرے کے گناہ کا بوجھ نہ اٹھائے گا ۔پھر ابوبکر کے نقل کے مطابق پیغمبر اکرم نے یہ کیسے فرما دیا کہ کسی کے رونے سے،ایک بے بس مردہ عذاب میں مبتلا ہوگا؟!

۲۔ ''انما حرّ جھنمّ علی امتی مثل الحمّام''یعنی، میری امت کیلئے جہنم کی گرمی حمام کی گرمی کے مانند ہے۔یہ بیان گناہگاروں کے گستاخ ہونے کا سبب بننے کے علاوہ ، جہنم کے بارے میں قرآن مجید میں بیان شدہ نصوص کے بالکل خلاف ہے ۔ جیسے '' وقودھا الناس و الحجارۃ ''اس کا ایندھن پتھر اور انسان ہیں اور اس آگ کے کوہ پیکر شعلے بیدار دلوں کو پگھلادیتے ہیں ۔بہر حال جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا ،جو احادیث حضرت ابوبکر سے نقل ہوئی ہیں وہ یا ان کے معمولی بیانات ہیں یا وہ چیزیں ہیں جو عقل و قرآن مجید سے ٹکراؤ رکھتی ہیں ۔ اور جسے حدیث کا نام دیا جائے ان میں بہت کم ملتی ہے۔ظاہر ہے کہ ایسا شخص ، ان ضعیف اور ناچیز معلومات کے ساتھ اسلامی معاشرے کو ارتقا اور کمال کی طرف رہنمائی نہیں کرسکتا اور امت کی ضروریات کو پورا نہیں کرسکتا ۔

خلیفہ ، خود اپنے ایک بیان میں اپنی معلومات سے پردہ اٹھاتے ہوئے کہتے ہیں'': انّی ولیت و لست بخیرکم و ان رأیتمونی علی الحق فأعینونی و ان رأیتمونی علی الباطل فسدونی[4]اے لوگو !تمہارے امور کی باگ ڈور میرے ہاتھ میں دیدی گئی ہے، جبکہ میں تم میں سے بہترین فرد نہیں ہوں ، اگر تم لوگ مجھے حق پر دیکھو تو میری مدد کرو اور اگر مجھے باطل پر دیکھو تو میری مخالفت کرو اور مجھے اس کام سے

[1] سیرۂ حلبی ، ج ۳ ، ص ۳۴، بحار ج ۲۲، ص ۱۵۷۔
[2] مغازی واقدی ، ج۲، ص ۷۶۶ ، بحار ، ج۲۱، ص ۵۴ ۔
[3] انعام / ۱۶۴
[4] طبقات ابن سعد، ج ۳،ص ۱۵۱۔

روکو''دین و مذہب کے قائد کو جس کے نقش قدم پر اسلامی معاشرے کو چلنا ہے دینی مسائل میں امت سے مدد کا محتاج نہیں ہونا چاہئے ۔ یہ ہرگز مناسب نہیں ہے کہ دینی قائد بجائے اس کے کہ امت کو تخلیق کے مقصد کی طرف راہنمائی کرے اپنی غلطیاں اور گمراہیاں سدھارنے کیلئے امت سے مدد مانگے ۔

خلیفہ اول کی لاعلمی کے چند نمونے:

یہاں پر ہم خلیفہ کے معلومات سے متعلق چند نمونے پیش کرتے ہیں جو بذات خود دینی مسائل کے بارے میں ان کے معلومات کی سطح کے گواہ ہیں ۔ یہ نمونے اس امر کی حکایت کرتے ہیں کہ وہ بہت سے روز مرہ کے مسائل کے جواب سے بھی ناواقف تھے:۱۔ ''دادی'' کی وراثت کا مسئلہ عام مسائل میں سے ہے خلیفہ اس کے بارے میں آگاہی نہیں رکھتے تھے ۔ ایک عورت کا پوتا فوت ہوگیا تھا اور اس نے اس سلسلے میں ان سے حکم خدا پوچھا ،انہوں نے جواب دیا کہ :کتاب خدا اور پیغمبرؐ کے ارشادات میں اس بارے میں کچھ بیان نہیں ہوا ہے ۔ اس کے بعد اس عورت سے کہا : تم جاؤ، میں رسول خداؐ کے صحابیوں سے پوچھوں گا کہ کیا انہوں نے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے اس سلسلے میں کچھ سنا ہے ؟! مغیرۃ بن شعبہ جو اسی مجلس میں موجود تھا ،اس نے کہا : میں پیغمبر خداؐ کی خدمت میں تھا،آپؐ نے دادی کیلئے میراث میں سے ۱/۳ حصہ مقرر فرمایا تھا[۱] ۔ خلیفہ کی لاعلمی زیادہ تعجب خیز نہیں ہے،بلکہ تعجب اس بات پر ہے کہ اس نے مغیرہ جیسے آلودہ اور بد کردار شخص سے حکم الٰہی سیکھا ۔

۲۔ ایک ایسا چور خلیفہ کے پاس لایا گیا جس کا ایک ہاتھ اور ایک پاؤں کاٹا جاچکا تھا ،انہوں نے حکم دیا اس کا پاؤں کاٹ دیا جائے، خلیفہ دوم نے اشارہ کیا کہ ایسے موقع پر سنت پیغمبرؐ یہ ہے کہ ہاتھ کاٹا جائے ،اس پر خلیفہ نے اپنا نظریہ بدل دیا اور خلیفہ دوم کے نظریہ کی پیروی کی[۲] ان دونمونوں سے فقہ اسلامی کے بارے میں خلیفہ کی معلومات کے کمی کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے اور واضح ہے کہ اس قدر

---

[۱] موطأ ابن مالک ص ۳۳۵۔
[۲] سنن بیہقی ، ج۸ ص ۲۷۳۔

معلومات کے فقدان اور مغیرہ جیسے افراد سے رجوع کرنے والے شخص کے ہاتھوں میں معاشرے کی معنوی قیادت کی باگ ڈور ہرگز نہیں دی جاسکتی ہے جس کی بنیادی شرط اسلامی احکام سے متعلق وسیع معلومات کا حامل ہونا ہے۔

خلیفہ دوم کے معلومات کا معیار:

حضرت عمر نے جن احادیث کو پیغمبر ؐسے نقل کیا ہے ان کی تعداد پچاس سے زیادہ نہیں ہے ۔ درج ذیل داستان خلیفہ دوم کے فقہی معلومات کی سطح کی صاف گواہ ہے : ا۔ ایک شخص نے حضرت عمر کے پاس آکر ان سے دریافت کیا: مجنب ہوں اور پانی تک رسائی نہیں حاصل کر سکا ۔ ایسے میں میرا فریضہ کیا ہے ؟حضرت عمر نے جواب دیا: تم سے نماز ساقط ہے، خوشبختی سے ''عمار '' اس جگہ موجود تھے انہوں نے خلیفہ کی طرف رخ کرکے کہا: یاد ہے کہ ایک جنگ میں ہم دونوں مجنب ہوئے تھے اور پانی نہ ہونے کی وجہ سے، میں نے مٹی سے تیمم کرکے نماز پڑھی تھی، لیکن تم نے نماز نہیں پڑھی تھی ؟ جب پیغمبر ؐسے یہ مسئلہ پوچھا گیا تو آپ ؐنے فرمایا: کافی تھا اپنے ہاتھوں کو زمین پر ماکر چہرے پرملتے یعنی تیمم کرتے ۔ خلیفہ نے عمار کی طرف رخ کرکے کہا: خدا سے ڈرو ؟ (یعنی اب اس بات کو بیان نہ کرنا)عمار نے کہا: اگر آپ نہیں چاہتے تو میں اس واقعہ کو کہیں بیان نہیں کروں گا[1]یہ واقعہ اہل سنت کی کتابوں میں مختلف صورتوں میں نقل ہوا ہے اور یہ تمام صورتیں اس امر کی حکایت کرتی ہیں کہ خلیفہ دوم مجنب کے بارے میں جس کے پاس پانی نہ تھا حکم الٰہی سے بے خبر تھے۔ قرآن مجید نے دو سوروں[2] میں ایسے شخص کا فریضہ بیان کیا ہے. لیکن ایسا لگتا ہے کہ قرآن مجید کی یہ دو آیتیں خلیفہ کے کانوں تک نہیں پہنچی تھیں!ایسا شخص جو بارہ سال تک کوشش کے بعد صرف سورۂ بقرہ یاد کر سکے اور اس کے شکرانہ کے طور پر قربانی کرے[3] بھلا وہ کس طرح ان آیات تک آسانی سے رسائی حاصل کر سکتا ہے ؟

۲۔ شکیات نماز کے احکام ایسے احکام ہیں جن کی ہر مسلمان کو ضرورت ہوتی ہے، بہت کم ایسے متدین افراد پیدا ہوں گے جو ان احکام سے آشنائی نہ رکھتے ہوں اب ذرا دیکھئے کہ اس سلسلے میں خلیفہ کی معلومات کس سطح کی تھی ؟ابن عباس کہتے ہیں : ایک دن حضرت عمر نے

---

[1] سنن ابن ماجہ ، ج ۱، ص ۲۰۰۔
[2] نساء ۔ ۴۳، مائدہ/ ۶۔
[3] الدر المنثور ج۱،ص ۲۱۔

مجھ سے پوچھا: اگر ایک شخص اپنی نماز کی تعداد کے بارے میں شک کرے تو اس کا فریضہ کیا ہے؟ میں نے خلیفہ کو جواب دیا کہ: میں بھی اس مسئلہ کے حکم سے واقف نہیں ہوں، اسی اثنا میں عبد الرحمان بن عوف آئے اور انہوں نے اس سلسلے میں رسول خدا کی ایک حدیث بیان کی[۱] شاید اس سلسلے میں ابن عباس کا جواب سنجیدہ نہ تھا، اور اگر رہا بھی ہو تو بھی خلیفہ کی ایسے موضوع کے سلسلہ میں ناآگاہی واقعاً حیرت انگیز ہے۔

۳۔ مستحب ہے کہ عورتوں کا مہر چار سو دینار سے زیادہ نہ ہو، حتی حدیث کی اصطلاح میں فقہا اسے ''مہر السنۃ'' کہتے ہیں، لیکن اس کے باوجود ہر فرد اپنی شریک حیات کی رضا مندی حاصل کرنے کیلئے اس سے زیادہ مہر مقرر کر سکتا ہے۔ ایک دن خلیفہ نے منبر سے مہر زیادہ ہونے کے خلاف تنقید کی اور اس مخالفت کا اس حد تک اظہار کیا کہ اعلان کر دیا کہ مہر کی زیادتی منع ہے۔ جب خلیفہ منبر سے نیچے اترے تو ایک عورت نے سامنے آکر ان سے سوال کیا: آپ نے عورتوں کے مہر میں اضافہ پر پابندی کیوں لگا دی، کیا خدائے تعالیٰ نے قرآن مجید میں یہ نہیں فرمایا ہے: (وَ آتَيْتُمْ اِحْدٰيهُنَّ قِنْطَارًا[۲]) اگر عورتوں میں سے ایک کو زیادہ مال دیدیا ہے تو حرج نہیں ہے'' اس وقت خلیفہ نے اپنی غلطی کا احساس کیا اور بارگاہ الٰہی میں رخ کر کے کہا: ''خدایا! مجھے بخش دے اور اس کے بعد کہا: تمام لوگ احکام الٰہی کے بارے میں عمر سے زیادہ واقف ہیں[۳] اس کے بعد دوبارہ منبر پر جا کر اپنی بات کی تردید کر دی[۴]

۴۔ شاید ہی کوئی ایسا شخص ہوگا جو یہ نہ جانتا ہو کہ الٰہی فرائض کی انجام دہی کیلئے عقل، طاقت اور بلوغ شرط ہے۔ اس کے باوجود، حضرت عمر کی خلافت کے زمانے میں ایک پاگل عورت کو بدکاری کے جرم میں خلیفہ کے حضور میں لایا گیا اور انہوں نے حکم صادر کر دیا کہ اسے سنگسار کیا جائے۔ خوشبختی سے جب مأمور اسے سنگسار کرنے کیلئے لے جا رہے تھے، حضرت علیؑ سے ملاقات ہوگئی۔ امام جب حقیقت سے آگاہ ہوئے تو انھیں واپس لوٹنے کا حکم دیا۔ جب خلفیہ کے پاس پہنچے تو ان کی طرف رخ کر کے فرمایا: کیا تمہیں یاد نہیں ہے پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا ہے: نابالغ، پاگل اور .... پر سے فرائض معاف کر دیے گئے ہیں؟ اس پر حضرت عمر نے ایک تکبیر کہی اور اپنا

---

[۱] مسند احمد، ج ۱، ص ۱۹۲۔
[۲] نساء/ ۲۰
[۳] ''کل الناس افقہ من عمر''
[۴] الغدیر، ج ۶. ص ۸۷ (اہل سنت کی مختلف اسناد سے منقول)

حکم واپس لے لیا ۔اس قسم کے ناحق فیصلے خلیفہ دوم کی زندگی کی تاریخ میں بہت ملتے ہیں ۔ مرحوم علامہ امینی نے الغدیر کی چھٹی جلد میں احکام اسلام کے بارے میں خلیفہ کی ناآگاہی کے سو واقعات مستند حوالوں کے ساتھ ذکر کئے ہیں اور ان کا نام ''نوادر الأثر فی علم عمر'' رکھا ہے ۔ان امور کے جائزہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی معاشرے کی قیادت ہرگز ایسے فرد کے ہاتھوں میں نہیں دی جا سکتی ہے جو کتاب و سنت اور فقہ اسلامی کے سلسلے میں اتنا بھی نہیں جانتا ہو کہ دیوانہ اور پاگل پر کوئی فریضہ عائد نہیں ہوتا ۔

کیا عقل اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ لوگوں کی ناموس اور اسلامی سماج کی باگ ڈور ایک ایسے شخص کے ہاتھوں میں دے دی جائے جو عاقل اور دیوانہ میں فرق نہ کرسکتا ہو؟کیا عقل اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ خدائے عادل لوگوں کی جان و مال کو ایک ایسے شخص کے سپرد کردے جو یہ بھی نہ جانتا ہو کہ عورت چھ ماہ میں بچے کو جنم دے سکتی ہے اور ایسی عورت پر بدکاری کی تہمت نہیں لگائی جا سکتی اور نہ اسے سنگسار کرنے کا حکم دیا جا سکتا ہے[1]؟

خلیفۂ سوم کے معلومات کا معیار:

الٰہی احکام کے بارے میں تیسرے خلیفہ کے معلومات بھی گزشتہ دو خلفاء سے زیادہ نہیں تھے ۔ ان کے ذریعہ پیغمبرؐ سے نقل کی گئی احادیث کی کل تعداد ۱۴۶ سے زیادہ نہیں ہے[2] اسلام کے اصول و فروع کے سلسلے میں حضرت عثمان کی آگاہی بہت کم اور ناچیز تھی قارئین کرام کی آگاہی کیلئے اسلامی تعلیمات سے ان کی بے خبری کے سلسلہ میں صرف ایک اشارہ پر اکتفا کی جاتی ہے: اسلام کے واضح احکام میں سے ایک حکم یہ ہے کہ مسلمان اور کافر کا خون برابر نہیں ہے اور پیغمبر اسلامؐ نے اس سلسلے میں فرمایا ہے'': لا یقتل مسلم بکافرٍ''،کافر کو قتل کرنے پر مسلمان کو قتل نہیں کیا جا سکتا ،بلکہ قاتل دیت ادا کرے گا ۔ لیکن افسوس ہے کہ خلیفہ سوم کی خلافت کے دوران جب ایک ایسا واقعہ پیش آیا تو خلیفہ نے قاتل کو قتل کرنے کا حکم صادر کردیا پھر بعض اصحاب رسولؐ کی یاد دہانی پر اپنے حکم کو بدلا[3] خلیفہ سوم کی زندگی میں ایسے بہت سے نمونے ملتے ہیں ۔ بیان کو مختصر کرنے کیلئے ہم ان کی تفصیلات سے صرف نظر کرتے ہیں اور

[1] اس کی تفصیل پانچویں فصل میں گزری ہے ۔
[2] الأضواء ، ص ۲۰۴
[3] سنن بیہقی ، ج ۸ ص ۳۳۔

ایک بار پھر بحث کے نتیجہ کی طرف آتے ہیں:امت اسلامیہ کی مذہبی قیادت کیلئے الٰہی احکام سے متعلق وسیع علم اور معلومات کا مالک ہونا شرط ہے اور ایسا علم عصمت یعنی گناہوں سے محفوظ رہے بغیر ممکن نہیں ہے اور افسوس ہے کہ پہلے تینوں خلفاء اس لطف الٰہی سے محروم تھے۔شاید مہاجرین و انصار کے ایک گروہ پر ہماری تنقید سُنی برادری کے بعض افراد کیلئے تعجب کا سبب بنے اور یہ سوچیں کہ یہ کیسے ممکن ہے ان حضرات کے قول و فعل کی عیب جوئی کرکے ان کو خطاکار قرار دیا جائے جبکہ قرآن مجید نے دو موقعوں پر ان کی ستائش کی ہے (وَالسّابِقُون الْأَوَّلُون مِن المُهَاجِرِين وَ الْأَنصَارِ وَ الَّذِين اتَّبَعُوهُمْ بِإِحْسٰنٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوا عَنْهُ وَ أَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِي تَحْتَهَا الْأَنْهَارُ خٰلِدِين فِيهَآ أَبَداً ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ) '' اور مہاجرین و انصار میں سے سبقت کرنے والے اور جن لوگوں نے نیکی میں ان کا اتباع کیا ہے ،ان سب سے خدا راضی ہوگیا ہے اور یہ سب خدا سے راضی ہیں اور خدا نے ان کیلئے وہ باغات مہیا کئے ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں اور یہ ان میں ہمیشہ رہنے والے ہیں اور یہی بہت بڑی کامیابی ہے[1] ''

٢۔ ایک دوسرے سورہ میں ان افراد کے بارے میں ،جنہوں نے سرزمین '' حدیبیہ '' پر ایک درخت کے سایہ میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی بیعت کی تھی ،یوں فرمایا ہے : (لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِين إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَنْزَلَ السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ وَ أَثَابَهُمْ فَتْحاً قَرِيباً) '' یقیناً خدا صاحبان ایمان سے اس وقت راضی ہوگیا جب وہ درخت کے نیچے آپ کی بیعت کررہے تھے پھر اس نے وہ سب کچھ دیکھ لیا جو ان کے دلوں میں تھا تو ان سب پر سکون نازل کردیا اور انہیں اس کے عوض قریبی فتح عنایت کردی[2] ''خلاصہ : پہلی آیۂ کریمہ میں خدائے تعالیٰ مہاجرین و انصار میں سے ان افراد کی ستائش کرتا ہے جو دوسرے لوگوں سے پہلے اسلام لائے اس کے بعد ان افراد کی بھی تعریف کرتا ہے جنہوں نے ان میں سے کسی ایک کی پیروی کی ہو۔دوسری آیۂ شریفہ میں ،خداوند کریم ان افراد کے بارے میں رضا مندی اور خوشنودی کا اظہار کرکے انھیں آرام و سکون اور فتح مکہ کی بشارت دیتا ہے ،جنہوں نے ساتویں ہجری کو سرزمین '' حدیبیہ '' پر پیغمبر کی بیعت کی تھی۔خدائے تعالیٰ کی طرف سے اس ستائش اور اظہار خوشنودی کے ہوتے ہوئے کس

[1] توبہ / ١٠٠۔
[2] فتح /١٨۔

طرح ممکن ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کی رحلت کے بعد رسول کے اصحاب اپنے فیصلوں میں خطا یا گناہ کے مرتکب ہوتے ہوں؟ مذکورہ بالا آیات کے مقاصد کی وضاحت کرنے سے پہلے ایک مطلب کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ اہل سنت کے علماء نہ فقط ان دو گروہوں (مہاجرین و انصار اور تابعین) کو جن کے بارے میں ان دو آیتوں میں اشارہ ہوا ہے عادل اور پاک دامن جانتے ہیں بلکہ ان کی اکثریت کا اعتقاد یہ ہے کہ تمام اصحابِ رسولؐ عادل ، منصف ، متقی اور پرہیزگار تھے ۔ مگر یہ کہ کسی ایک کے بارے میں کسی واقعہ میں فسق و انحراف ثابت ہوجائے ۔

مختصر یہ کہ جس کسی نے پیغمبر اسلامؐ کی مصاحبت کا شرف حاصل کیا ہے اسے عادل اور پاک دامن جاننا چاہئے، مگر یہ کہ اس کے برخلاف کچھ ثابت ہوجائے ۔ اس جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابیوں جن کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ ہے، کے تانے بانے ہی جدا ہیں ، یعنی جوں ہی کوئی فرد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضور مشرف ہوتا تھا ، ایک روحانی انقلاب پیدا کرکے اس لمحہ کے بعد اپنی پوری زندگی میں صحیح ، عادل اور پاک دامن ہونے کی سند حاصل کرلیتا تھا ۔ صحابیوں کے بارے میں ایسی بات کہنا ، ان میں سے ایک گروہ کی بد کرداری پر پردہ ڈالنے کے مترادف ہے ، کیونکہ ایسے افراد کا ضعیف عمل اور بعض مواقع ، جیسے ، جنگ احد و جنگ حنین میں ان کا فرار کرنا ان کے ایمان میں کمزوری خود رسالت مآب اور آپؐ کے عالی مقاصد کے تئیں ان کی بے توجہی کی واضح دلیل ہے قارئین کرام جنگ '' احد '' میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ان کی بے وفائی کے بارے میں نازل شدہ آیات کی تحقیق کرکے حقیقت کو بخوبی محسوس کر سکتے ہیں ۔ یہ کس طرح کہا جاسکتا ہے کہ تمام صحابی عادل اور پاک دامن تھے ، جبکہ قرآن مجید ان کے ایک گروہ کے حلقۂ منافقین میں ہونے کے بارے میں یوں فرماتا ہے: (وَ اِذْ یَقُولُ الْمُنَافِقُونَ وَ الَّذِینَ فِی قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَ رَسُولُهُ إِلَّا غُرُوراً) '' اور جب منافقین اور جن کے دلوں میں مرض تھا ، یہ کہہ رہے تھے کہ خدا اور اس کے رسولؐ نے ہم سے جو وعدہ کیا تھا وہ سراسر دھوکہ ہے[۱] '' کیا ایسی بات کہنے والوں کو عادل و منصف کہا جاسکتا ہے ؟ جبکہ ایسا کہنے والے کو حقیقی مسلمان بھی نہیں کہا جاسکتا ہے ۔ قرآن مجید صحابہ کے ایک گروہ کا تعارف '' سماعون '' کی حیثیت سے کراتا ہے ۔ اس لفظ سے مراد وہ افراد

[۱] احزاب / ۱۲

تھے جو منافقین کی باتوں کو فوراً قبول کرلیا کرتے تھے، فرماتا ہے: (لَوْ خَرَجُوا فِيكُمْ مَا زَادُوكُمْ إِلَّا خَبَالًا وَلَأَوْضَعُوا خِلَالَكُمْ يَبْغُونَكُمُ الْفِتْنَةَ وَفِيكُمْ سَمَّاعُونَ لَهُمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ) اگر یہ (منافقین) تمہارے ساتھ نکل بھی پڑتے تو تمہاری وحشت میں اضافہ ہی کرتے اور تمہارے درمیان فتنہ کی تلاش میں گھوڑے دوڑاتے پھرتے اور تم میں ایسے لوگ بھی تھے جو ان کی باتوں کو خوب سننے والے تھے اور اللہ تو ظالمین کو اچھی طرح جانتا ہے[1]۔ اس گروہ کے تمام افراد کو کیسے عادل و پاک دامن جانا جاسکتا ہے ،جبکہ خالد بن ولید (بعض اہل سنت مصنفین کے عقیدہ کے مطابق اس نے پیغمبرؐ سے ''سیف اللہ '' کا لقب حاصل کیا تھا) فتح مکہ کے سال ایک خطرناک جرم کا مرتکب ہوا اور قبیلہ ''بنی خزیمہ'' کی ایک جماعت کو ضمانت اور عہد وپیمان کے بعد دھوکہ و فریب سے قتل عام کرڈالا۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب اس مجرمانہ حرکت کی خبر سنی تو قبلہ کی طرف رخ کرکے کھڑے ہوئے اور اپنے ہاتھوں کو بلند کرکے ''استغاثہ'' کی حالت میں فرمایا '': اللھم انّی أبرءالیک مما صنع خالد بن ولید ''خدا !جو کچھ خالد بن ولید نے انجام دیا ہے، میں اس سے بیزار ہوں[2]۔ اس نام نہاد ''سیف اللہ '' کے کارناموں کی سیاہ فائل یہیں پر بند نہیں ہوتی بلکہ پیغمبر اسلامؐ کی رحلت کے بعد مالک بن نویرہ اور اس کے قبیلہ کے ساتھ کئے گئے اس کے بہیمانہ جرائم تاریخ کے صفحات میں ضبط ہوچکے ہیں ۔ اس نے مالک کو___جو ایک مسلمان تھا قتل کرڈالا اور اس کی بیوی کے ساتھ اسی شب اپنا منہ کالا کیا۔

حق و باطل پہچاننے کا راستہ :

اصولی طور پر یہ سب سے بڑی غلطی ہے کہ ہم حق و باطل کو افراد کے ذریعہ پہچانیں اور ان کی رفتار و گفتار کی حقانیت کیلئے ان کی شخصیت کو معیار قرار دیں، جبکہ ایک شخص کا عقیدہ اور قول و فعل اس کی حقانیت کی علامت ہوتا ہے، نہ کہ بر عکس۔ ''برٹینڈرسل '' علم ریاضی کا ایک بڑا دانشور ہے اور ریاضیات میں اس کے نظریے نمایاں اور علماء کے لئے قابل قبول ہیں، لیکن اس کے باوجود وہ ایک ملحد ہے اور خدا و الٰہی مقدسات کا منکر شمار ہوتا ہے، وہ اپنی کتاب ''میں کیوں عیسائی نہیں ہوں'' میں خدا پرستوں کے دلائل سے ناواقفیت کے

---

[1] توبہ / ۴۷۔
[2] سیرۂ ابن هشام ، ج ۲ ، ص ۴۳۰۔

سبب صراحت کے ساتھ لکھتا ہے ''؛ میں ایک زمانے میں خدا پرست تھا اور اس کی بہترین دلیل ''علۃ العلل'' جانتا تھا لیکن بعد میں اس عقیدہ سے پھر گیا. کیونکہ میں نے سوچا اگر ہر چیز کیلئے ایک علت اور خالق کی ضرورت ہے تو خدا کیلئے بھی ایک خالق ہونا چاہئے[۱]''کیا عقل ہمیں اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ ''رسل'' کی شخصیت کو خدا کے بارے میں اس کے فاسد فلسفی نظریہ___ جبکہ کائنات کے تمام ذرات خدا کے وجود کی گواہی دیتے ہیں___ کے صحیح ہونے کی بنیاد قرار دیں؟ واضح ہے کہ ہمیں اپنے فیصلوں میں افراد کی علمی و سیاسی شخصیت سے متأثر نہیں ہونا چاہئے اور ان کے افکار و اعتقادا اور قول و فعل کو ہر طرح کے حب و بغض سے اوپر اٹھ کر صرف عقل و منطق کے معیار پر تولنا چاہئے۔

یہاں مناسب ہے کہ ہم اس موضوع کے بارے میں امیر المؤمنین علیہ السلام کے پائیدار اور مستحکم نظریہ کی طرف بھی اشارہ کردیں۔جنگ جمل میں کچھ لوگ حضرت علیؑ کے طرفدار اور کچھ لوگ طلحہ، زبیر اور ام المؤمنین عائشہ کے طرفدار تھے ۔ اس حالت میں دو دلی کا شکار ایک آدمی جو حضرت علیؑ کی عظیم شخصیت سے بھی آگاہ تھا، آگے بڑھا اور بولا : کیسے ممکن ہے کہ یہ لوگ باطل پر ہوں، جبکہ ان کے درمیان طلحہ، زبیر اور ام المؤمنین عائشہ جیسی شخصیتیں موجود ہیں، کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان افراد نے باطل کا راستہ اختیار کیا ہوگا ؟! امیر المؤمنینؑ نے اس کے جواب میں ایک ایسی بات بیان فرمائی کہ مصر کا مشہور دانشور ڈاکٹر طہٰ حسین اس کے بارے میں کہتا ہے : ''وحی کا سلسلہ بند ہونے کے بعد انسان کے کانوں نے اب تک ایسی با عظمت بات نہیں سنی ہے'' امامؑ نے فرمایا ''؛انک لملبوس علیک، ان الحق و الباطل لا یعرفان بأقدار الرجال، اعرف الحق تعرف اهله، اعرف الباطل تعرف أهله'' یعنی، تم نے حق و باطل کو پہچاننے کے معیار میں غلطی کی ہے ۔

حق و باطل ہرگز افراد کے ذریعہ نہیں پہچانے جاتے، بلکہ پہلے حق کو پہچاننا چاہئے پھر اہل حق کو پہچانا جاسکتا ہے، پہلے باطل کو پہچاننا چاہئے پھر اہل باطل کی تمیز دی جاسکتی ہے ۔امیر المؤمنین کی یہ عظیم فرمائش___ کہ بقول ڈاکٹر طہٰ حسین، وحی الٰہی کے بعد انسان کے کانوں نے ایسا کلام نہیں سنا ہے بعض سنی علماء کے اس اصول کو پوری طرح بے بنیاد ثابت کرتا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ کے تمام اصحاب

[۱] چرا مسیحی نیستم

عادل ہیں ۔اب ہم یہاں پر قرآن مجید کی مذکورہ بالا دو آیتوں کے سلسلہ میں بحث کرتے ہیں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ پہلی آیت اس امر کی حکایت کرتی ہے کہ خدائے تعالیٰ دو گروہوں سے راضی ہوا ہے اور اس نے اپنی بہشت کو ان کیلئے آمادہ کیا ہے ۔ یہ دو گروہ حسب ذیل ہیں: ا۔ مہاجرین و انصار کا ایک گروہ ، جنھوں نے ایمان اور اسلام لانے میں دوسرے لوگوں پر سبقت حاصل کی ہے اور نازک لمحات میں دین کی راہ میں قربانیاں دی ہیں ۔

۲۔ وہ لوگ جنھوں نے شائستہ طورپر مہاجرین و انصار کی پیروی کی ہے ۔قرآن مجید نے پہلے گروہ کے بارے میں (السّابِقُون الاَوَّلُون) اور دوسرے گروہ کے بارے میں (وَ الَّذِین اتَّبَعُوهُم بِاِحسان) کی اصطلاح استعمال کی ہے ۔لیکن قابل غور امر یہ ہے کہ کیا ،جو چیز ان سے خدا کی خوشنودی و رضا مندی کا سبب بنی صرف ان کی اسلام اور پیغمبر ؐپر ایمان لانے میں سبقت تھی ،اور کیا اس خوشنودی و رضا مندی کی بقاء و دوام بلا قید و شرط ہے ؟واضح تر الفاظ میں : کیا اگر یہ افراد بعد والے زمانوں میں فکری یا اختلافی انحراف کا شکار ہوکر ظلم و جبر کے مرتکب ہوجائیں ، تو کیا پھر بھی وہ خدا کی رضا مندی اور خوشنودی کے حقدار ہوں گے اور قہر و غضب ان کے شامل حال نہیں ہوگا ؟یا یہ کہ اسلام لانے میں ان کی سبقت کیلئے خدا کی رضا مندی اور خوشنودی کا باقی رہنا اس امر پر مشروط ہے کہ ان کا ایمان و عمل صالح ان کی زندگی کے تمام ادوار میں باقی رہے ،اور اگر ان دو شرائط ،میں ان کی زندگی میں کبھی خلل پیدا ہوجائے تو ان کی اسلام میں سبقت اور مہاجر و انصار کے عنوان کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا ؟قرآن مجید کی دیگر آیات کی تحقیق سے قطعی طور پر دوسرے نظریہ کی تائید ہوتی ہے کہ خدا کی طرف سے اپنے بندوں کیلئے کامیابی اور خوشنودی کی بقا اسی شرط پر ہے کہ وہ اپنی پوری زندگی میں ایمان اور عمل صالح پر قائم و دائم رہیں ۔

ملاحظہ ہوں اس قسم کی چند آیات کے نمونے: قرآن مجید سورۂ حشر[۱] میں مہاجرین کی ایک جماعت کی اس بات پر ستائش کرتا ہے کہ انھوں نے اپنا سب مال و منال چھوڑ کر مدینہ ہجرت کی تھی ،اس کے بعد ان کی ستائش کا سبب مندرجہ ذیل عبارتوں میں بیان فرمایا ہے ۔ (یَبْتَغُون فَضْلاً مِن اللّٰہِ وَ رِضْوَاناً وَیَنْصُرُون اللّٰہَ وَ رَسُولَہُ) وہ لوگ ہمیشہ خدا کے فضل و کرم اور اس کی مرضی کے طلبگار رہتے ہیں اور خدا و

[۱] حشر / ۸۔

رسول کی مدد کرنے والے ہیں ۔یہ آیۂ شریفہ اس بات کی حکایت کرتی ہے کہ انسان کی نجات کیلئے ہجرت کرنا گھر بار اور مال و منال کو چھوڑنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ خدا کی خوشنودی کے اسباب فراہم کرنے کی مسلسل کوشش کرنا اور اپنے نیک اعمال کے ذریعہ خدا اور اس کے رسولؐ کی مدد کرنا بھی ضروری ہے ۔قرآن مجید فرماتا ہے : فرشتے ، جو عرش کے اطراف میں خدائے تعالیٰ کی تسبیح کرتے ہیں ، با ایمان افراد کیلئے اس طرح دعائے مغفرت کرتے ہیں : (فَاغْفِرِ لِلَّذِینَ تَابُو وَ اتَّبَعُوا سَبِیلَکَ) ''خدایا !جو تیری طرف لوٹ آئے ہیں اور تیرے دین کی پیروی کرتے ہیں ، انہیں بخش دے '' قرآن مجید اصحاب پیغمبرؐ میں سے ان افراد کی ستائش کرتا ہے جو کافروں کے ساتھ سختی سے پیش آتے ہیں اور آپس میں مہربان ہیں ، رکوع و سجود بجالاتے ہیں ۔

خدا کے کرم و خوشنودی کے طالب ہیں اور ان کے چہروں پر سجدوں کی نشانیاں نمایاں ہیں[۱] اس کے علاوہ قرآن عفو و بخشش اور عظیم اجر کا حقدار ان اصحاب رسولؐ کو جانتا ہے جو خدا پر ایمان لائے اور نیک اعمال انجام دیتے ہیں[۲] مذکورہ آیات او ران کے علاوہ دیگر آیات اس بات کی گواہ ہیں کہ مہاجرین و انصاریا سابقین و تابعین کے عنوان ، سعادت مند و نجات یافتہ ہونے کے لئے کافی شرط نہیں ہیں بلکہ اس فضیلت کے ضمن میں دیگر فضائل ، جیسے نیک اعمال کی انجام دہی اور بُرے کاموں سے پرہیز کی شرط بھی ضروری ہے ، ورنہ یہ لوگ درج ذیل آیات کے زمرے میں شامل ہوں گے : ۱۔ (فَإِنَ اللّٰہ لَا یَرْضیٰ عَنِ القَومِ الفَاسِقِین) خدائے تعالیٰ فاسقوں کے گروہ سے راضی نہیں ہوتا[۳] ۔ ۲۔ (وَ اللّٰہ لَا یُحِبُّ الظَّالِمِین)خدائے تعالیٰ ظالموں کو دوست نہیں رکھتا[٤] ۔پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ایمان کے بلند ترین مقام پر فائز اور فضیلت و اخلاق کا نمونہ تھے ،

لیکن پھر بھی خدائے تعالیٰ واضح الفاظ میں آپؐ کو خبردار کرتے ہوئے فرماتا ہے : (لِءِن أَشْرَکْتَ لَیَحْبَطَن عَمَلُکَ وَ لَتَکُونَن مِن الخَاسِرِین[۵]) اگر تم شرک اختیار کرو گے تو تمہارے تمام اعمال برباد ہو جائیں گے اور تمہارا شمار گھاٹا اٹھانے والوں میں ہوگا '' بیشک

---

[۱] (مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللهِ وَ الَّذِینَ مَعَہُ أَشِدَّآءُ عَلٰی الکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ تَرٰیھُمْ رُکَّعاً سُجَّداً یَبْتَغُونَ فَضْلاً مِّنَ اللهِ وَ رِضْوَاناً سِیمَاھُم فِی وُجُوھِھِمْ مِنْ أَثَرِ السُّجُودِ)(فتح/ ۲۹)

[۲] (وَعَدَ اللهُ الّذِینَ آمَنُوا وَ عَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنْھُمْ مَغْفِرَةً وَ أَجْراً عَظِیماً) (فتح/ ۲۹)

[۳] توبہ/ ۹۶۔

[٤] آل عمران /۵۷۔

[۵] زمر /۶۵

پیغمبر اکرمؐ کا قوی ایمان اور آپؐ کی عصمت ایک لمحہ کیلئے بھی آپؐ کو شرک کی طرف مائلنہیں کرسکتی، لیکن یہاں پر قرآن مجید آپ سے مخاطب ہوکر در حقیقت دوسروں کو خبردار کرتا ہے کہ چند نیک اعمال کے دھوکے میں نہ رہیں بلکہ کوشش کریں کہ زندگی کی آخری سانس تک اسی نیک حالت پر باقی رہیں ۔ س بنا پر ہمیں ہرگز یہ تصور نہیں کرنا چاہئے کہ پیغمبر کا صحابی ہونا اور سابقین و تابعین کے زمرے میں شمار ہونا کسی کو ایسا تحفظ بخش دے گا کہ اگر وہ بعد میں کوئی غلط قدم بھی اٹھائے، پھر بھی خدا کی خوشنودی کا مستحق قرار پائے گا ۔

ان ہی مہاجرین اور انصار یا سابقین و تابعین میں سے بعض افراد خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں ہی مرتد ہوگئے تھے اور پیغمبر خدا کی جانب سے انہیں سخت ترین سزا کا حکم سنا دیا گیا ،اس وقت کسی نے بھی اعتراض نہیں کیا کہ :اے پیغمبرؐ! خدا وند کریم ان سے راضی ہوگیا ہے، آپؐ انہیں کیوں یہ سخت سزا سنارہے ہیں ؟اس سیاہ فہرست کے چند نمونے ملاحظہ ہوں:۱۔ عبد اللہ بن سعد بن ابی سرح : وہ مہاجرین میں سے تھا اور کاتب وحی تھا اس کے بعد مرتد ہوگیا اور اس نے کہا :(سَأُنْزِلُ مِثْلَ مَا أَنْزَلَ اللّٰہ[1]) میں بھی خدا کی طرح کی باتیں نازل کرسکتا ہوں

فتح مکہ میں پیغمبر اسلامؐ نے چند افراد کے قتل کا حکم دیدیا اور فرمایا : جہاں کہیں وہ ملیں انہیں فوراً قتل کردیا جائے، ان میں سے ایک یہی ''عبداللہ'' تھا، لیکن فتح مکہ کے بعد اس نے حضرت عثمان کے وہاں پناہ لے لی، کیونکہ وہ حضرت عثمان کا رضاعی بھائی تھا . حضرت عثمان کی سفارش اور اصرار کے سبب پیغمبر اکرمؐ نے اسے چھوڑدیا ۔پیغمبرؐ اس شخص سے اس قدر نفرت کرتے تھے کہ اس کو معاف کرنے کے بعد آنحضرت نے اپنے اصحاب سے فرمایا : جب تم لوگوں نے دیکھا کہ میں اسے معاف کرنے سے انکار کررہا ہوں اس وقت تم لوگوں نے اسے قتل کیوں نہیں کرڈالا[2]؟

۲۔ عبید اللہ بن جحش : وہ اسلام کے سابقین اور مہاجرین حبشہ میں سے تھا ، لیکن حبشہ ہجرت کرنے کے بعد اسلام چھوڑ کر اس نے عیسائی دین قبول کرلیا ۔

---

[1] انعام / ۹۳۔
[2] الاصابۃ ، ج ۲، ص ۳۸

۳۔ حکم بن عاص : وہ ان لوگوں میں سے تھا جو فتح مکہ کے بعد ایمان لائے تھے، لیکن پیغمبر اسلامؐ نے چند وجوہات کی بنا پر اسے طائف جلا وطن کردیا۔

۴۔ حرقوص بن زہیر : اس نے بیعت رضوان میں شرکت کی تھی، لیکن غنائم کی تقسیم پر اس نے پیغمبر اسلامؐ سے تند کلامی کی اس پر رحمۃ للعالمین پیغمبرؐ برہم ہوگئے اور فرمایا : وائے ہو تم پر ،اگر میں انصاف و عدالت کی رعایت نہ کروں گا تو کون انصاف کرے گا ؟!اس کے بعد اس کے خطرناک مستقبل کے بارے میں فرمایا : حرقوص ایک ایسے گروہ کا سردار بنے گا جو دین اسلام سے اسی طرح دور ہوجائیں گے جس طرح کمان سے تیر نکل کر دور جاتا ہے'' پیغمبر اسلامؐ کی یہ پیشین گوئی آپ کی رحلت کے سالہا بعد حقیقت ثابت ہوئی ۔ یہ شخص خوارج کا سردار بنا اور جنگ نہروان میں حضرت علیؑ کی تلوار سے قتل ہوا ۔

یہ اس سیاہ فہرست کے چند نمونے تھے جس میں بہت سے اصحاب پیغمبرؐ (مہاجر و انصار) موجود ہیں ۔ پیغمبر اسلامؐ کے صحابیوں کی تحقیق کے دوران ہمیں چند دوسرے افراد بھی نظر آتے ہیں : جیسے: حاطب بن ابی بلتعہ ،جو اسلام کے خلاف جاسوسی کرتا تھا یا ولید بن عقبہ ،جسے قرآن مجید نے سورۂ حجرات[1] میں فاسق کہا ہے یا خالد بن ولید ، جس کا نامہ اعمال اس کے کالے کرتوتوں سے بھرا پڑا ہے[2] کیا صحابیوں میں ایسے افراد کی موجودگی کے باوجود بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ خدائے تعالیٰ سابقین اور تابعین سے راضی ہوچکا ہے اب کسی کو بھی ان کی طرف ٹیڑھی نگاہ سے دیکھنے کا حق نہیں ہے ؟! مختصر یہ کہ خدا کی رضا و خوشنودی ،ان کے عمل سے مربوط ہے ،یعنی خدائے تعالیٰ ان افراد سے راضی و خوشنود ہوا ہے ،جنھوں نے غربت کے زمانے میں اسلام اور رسول خداؐ کی حمایت و مدد کی ہے لیکن اس قسم کی خوشنودی کا اظہار اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ ان کی یہ خوشنودی ان افراد کی زندگی کی آخری سانس تک باقی رہے گی ۔ بلکہ اس کی بقا کی شرط یہ ہے کہ ان کا ایمان اسی حال میں باقی رہے اور وہ ایسا کوئی کام انجام نہ دیں جو ان کے کفر ،ارتداد ، فسق اور اعمال صالح کے برباد ہوجانے کا سبب بنے ۔ دوسرے الفاظ میں ، مہاجرین وانصار کا ایمان و اخلاص ، بھی دوسرے نیک اعمال کی طرح اس پر مشروط ہے کہ بعد میں کوئی

---

[1] حجرات / ۶۔
[2] مذکورہ افرادا ن منافقوں کے گروہ کے علاوہ ہیں جن کی داستان مفصل ہے ۔

ایسا کام انجام نہ دیں جو ان کے اس عمل کو بے اثر بنا کردے ورنہ ان کا یہ نیک عمل باقی نہ رہے گا ۔ علماء کی اصطلاح میں جس پاداش کا اس آیت میں ذکر ہوا ہے (رضا مندی و بہشت) یہ ایک ''نبی'' پاداش ہے ۔ یعنی وہ اس لحاظ سے ایسی پاداش کے حقدار ہیں لیکن اس سے بھی انکار نہیں ہے کہ اگر یہی لوگ بعد میں خدا کی نافرمانی کے کام انجام دیں گے تو غضب الہی اور جہنم کے مستحق ہوجائیں گے ۔ اس قسم کی آیات کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سابق صحابیوں کو تحفظ بخش دیں چونکہ خداوند تعالیٰ ان سے خوشنود ہوگیا ہے، لہٰذا وہ جو چاہیں انجام دیں یا ان میں سے اگر کوئی کسی غیر شرعی کام کا مرتکب ہوگیا ہو تو ہم اس آیت کے حکم کی تاویل و تحریف پر مجبور ہوں کیونکہ اس آیت نے ان کے سلسلے میں قطعی حکم صادر کردیا ہے ! نہیں ایسی ضمانت انبیاء اور اولیاء میں بھی کسی کو نہیں ملی ہے حتی خود رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی ایسی ضمانت نہیں ملی ہے ۔

قرآن مجید حضرت ابراہیمؑ اور ان کے فرزندوں جیسے اسحاقؑ، یعقوبؑ، موسیؑ و ہارونؑ وغیرہ کے بارے میں فرماتا ہے: (وَ لَوْ أَشْرَكُوا لَحَبِطَ عَنْهُم مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ[1]) اگر یہ لوگ شرک اختیار کر لیتے تو ان کے سارے اعمال برباد ہوجاتے'' گزشتہ بحثوں میں یہ ثابت ہوا کہ خدا کی طرف سے امام کا تعین دنیاوی ''مطلق العنان'' نظام سے بالکل مختلف ہے ، لوگوں میں قوانین الٰہی کی روشنی میں حکم کرنے اور انصاف قائم کرنے کیلئے جو حاکم خدا کی طرف سے معین ہوتا ہے، اس کی حکومت روئے زمین پر قابل تصور حکومتوں میں سب سے زیادہ عادل اور مستحکم حکومت ہے ۔

اس قسم کی حکومت میں، حاکم و فرماں روا خدا کی طرف سے منتخب ہوتا ہے ۔ خدا بھی اپنے حکیمانہ ارادہ سے ہمیشہ بہترین وشائستہ ترین فرد کو رہبر کے عنوان سے منتخب کرتا ہے اور خدا کے علم و تشخیص میں کسی بھی قسم کی غلطی و خطا یا غیر منطقی میلان کا امکان نہیں پایا جاتا ۔ خدائے تعالیٰ انسان کے بارے میں مکمل آگاہی رکھتا ہے اور اپنے بندوں کے بارے میں ان کی مصلحتوں اور ضرورتوں سے ان سے زیادہ واقف ہے ۔ جس طرح خدا کے قوانین اور احکام بہترین اور عالی ترین قوانین و احکام ہیں اور کوئی بھی قانون خدا کے قانون کے برابر نہیں ہے، اسی طرح خدا کی طرف سے معین شدہ پیشوا اور رہبر بھی بہترین پیشوا اور شائستہ ترین و رہبر ہوگا ایک ایسا قائد و فرمان

[1] انعام / ۸۸۔

روا جس کی زندگی دسیوں سہو و خطا اور نفسانی خواہشات سے آلودہ ہو وہ خدا کی طرف سے منتخب شدہ رہبر وقائد کا ہم پلہ ہرگز نہیں ہوسکتا ہے۔گزشتہ بحثوں میں یہ بھی ثابت ہوا کہ اسلامی معاشرہ ہمیشہ ایک ایسے معصوم امام کا محتاج ہے جو الٰہی قوانین اور احکام سے آگاہ ہوتا ہے،کہ امت کیلئے فکری اور علمی پناہ گاہ بن سکے ۔اصولی طور پر اسلامی معاشرہ فکری اور علمی لحاظ سے ارتقاء کی اس حد تک نہیں پہنچا تھا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی رحلت کے بعد اپنا نظم و نسق خود سنبھال سکے اور اس قسم کے ایک الٰہی رہبر سے بے نیا ہوجائے۔اب ہم غور کریں اور دیکھیں کہ ان تمام حالات کے تناظر میں پیغمبر الٰہی نے اسلامی امت کی قیادت کیلئے کس کو معین فرمایا تھا اور اس مسئلہ کو ہمیشہ کیلئے حل کردیا تھا ۔

یہاں پر ہم ایسے نقلی دلائل کا سہارا لیتے ہیں وہ دلائل جو قطعی طور سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے صادر ہوئے اور اصطلاحاً متواتر ہیں اور ان میں جھوٹ اور جعل سازی کا ہرگز امکان نہیں ہے ۔ اس کے علاوہ ایسی روایتوں کا مفاد یہ ہے کہ ان،کی دلالت کسی خاص فرد یا افراد کی امامت و پیشوائی کے بارے میں اتنی واضح اور روشن ہو کہ ہر قسم،کے شک و شبہ کو دلوں سے نکال دے اور کسی بھی انصاف پسند انسان کیلئے سوال اور تذبذب کی گنجائش باقی نہ رہے۔لہذا ہم یہاں پر چند ایسے نقلی دلائل کی طرف اشارہ کریں گے جن کی روایت پیغمبرا کرم،سے قطعی اور مقصود کے بارے میں ان کی دلالت بھی واضح ہے۔کتاب کے صفحات اور قارئین کرام کے وقت کی کمی کے پیش نظر ہم یہاں لوگوں پر امیر المؤمنین،کی پیشوائی و ولایت کے سلسلے میں نقل ہوئے دلائل کی ایک بڑی تعداد میں سے حسب ذیل کا انتخاب کرتے ہیں:

۱۔ حدیث منزلت

شام کی طرف سے آنے والے تاجروں کے ایک قافلہ نے حجاز میں داخل ہونے کے بعد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو یہ خبر دی کہ روم کی فوج مدینہ پر حملہ کرنے کی تیاری کررہی ہے کسی حادثہ کے بارے میں حفظ ،ماتقدم اس کے مقابلے سے بہتر ہے ۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی طرف سے مدینہ منورہ اور اس کے اطراف میں فوجی آمادگی کا اعلان ہوا ۔ مدینہ منورہ میں سخت گرمی کا عالم تھا ،

پھل پکنے اور فصل کاٹنے کا موسم تھا، اس کے باوجود تیس ہزار شمشیر زن اسلام کی چھاؤنی میں جمع ہوگئے اور اس عظیم جہاد میں شرکت پر آمادگی کا اعلان کیا ۔ چند مخبروں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو یہ خبر دی کہ مدینہ کے منافق منصوبہ بندی کر رہے ہیں کہ آپ کی عدم موجودگی میں مدینہ میں بغاوت کر کے خون کی ہولی کھیلیں گے ۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ہر قسم کے حادثہ کی روک تھام کے لئے حضرت علی کو اپنا جانشین مقرر فرما کر انھیں حکم دیا کہ آپ مدینہ میں ہی رہیں اور میری واپسی تک حالات پر نظر رکھیں اور لوگوں کے دینی و دنیاوی مسائل کو حل کریں ۔

جب منافقین حضرت علی علیہ السلام کے مدینہ میں رہنے کی خبر سے آگاہ ہوئے، تو انھیں اپنی سازشیں ناکام ہوتی نظر آئیں ۔ وہ کسی اور تدبیر میں لگ گئے وہ چاہتے تھے کہ کوئی ایسا کام کریں جس سے حضرت علی علیہ السلام مدینہ سے باہر چلے جائیں ۔ لہذا انہوں نے یہ افواہ پھیلادی کہ حضرت علی اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے درمیان رنجش پیدا ہوگئی ہے اسی لئے پیغمبر نے علی کے ساتھ یہ سلوک کیا ہے کہ انھیں اس اسلامی جہاد میں شرکت کرنے کی اجازت نہیں دی!مدینہ میں حضرت علی کے بارے میں جو روز پیدائش سے ہی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی مہر و محبت کے سائے میں پلے بڑھے اس قسم کی افواہ کا پھیلنا ، حضرت علی اور آپ کے دوستوں کیلئے شدید تکلیف کا سبب بنا ۔

لہذا حضرت علی اس افواہ کی تردید کیلئے مدینہ سے باہر نکلے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی خدمت میں پہنچے ،جو ابھی مدینہ منورہ سے چند میل کی دوری پر تھے آپ نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو اس واقعہ سے آگاہ فرمایا ۔ یہاں پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کے تئیں اپنے بے پایاں جذبات اور محبت کا اظہار کرتے ہوئے آپ کے مقام و منزلت کو درج ذیل تاریخی جملہ میں بیان فرمایا ''؛اما ترضی ان تکون منّی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ، الّا انہ لا نبیّ بعدی، انّہ لا ینبغی ان اذھب الّا و انت خلیفتی ''یعنی کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ تمہیں مجھ سے وہی نسبت ہے جیسی ہارون کو موسی سے تھی، بس فرق یہ ہے کہ میرے بعد کوئی پیغمبر نہیں ہوگا؟ میرے اس دنیا سے جانے کے بعد تم ہی میرے جانشین اور خلیفہ ہوگے'' یہ حدیث جو اسلامی محدثین کی اصطلاح میں

حدیث ''منزلت'' کے نام سے مشہور ہے متواتر اور قطعی احادیث میں سے ہے۔ مرحوم محدث بحرانی نے کتاب '' غایۃ المرام'' میں ان افراد کا نام ذکر کیا ہے، جنھوں نے اس حدث کو اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے اور ایک دقیق و صحیح تحقیق سے ثابت کیا ہے کہ اسلامی محدثین نے اس حدیث کو ۱۵۰ طریقوں سے نقل کیا ہے جن میں ۱۰۰ طریقے اہل سنت علماء و محدثین تک منتہی ہوتے ہیں [1] مرحوم شرف الدین عاملی نے بھی کتاب '' المراجعات '' میں اس حدیث کے اسناد کو اہل سنت محدثین کی کتابوں سے نقل کیا ہے اور ثابت کیاہے کہ یہ حدیث ان کی دس حدیث اور رجال کی کتابوں میں نقل ہوئی ہے [2] ''اس حدیث کے صحیح ہونے کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ اہل سنّت کے صحاح لکھنے والوں ''بخاری'' اور '' مسلم '' نے بھی اسے اپنی صحاح میں ذکر کیا ہے [3] اس حدیث کے محکم ہونے کے بارے میں یہی کافی ہے کہ امیر المؤمنین کے دشمن '' سعد و وقاص '' نے اسے حضرت علی علیہ السلام کی زندگی کی تین نمایاں فضیلتوں میں سے ایک فضیلت شمار کیا ہے ۔

جب معاویہ اپنے بیٹے ''یزید'' کے حق میں بیعت لینے کیلئے مکہ میں داخل ہوا ،اور ''الندوۃ'' کے مقام پر ایک انجمن تشکیل دی جس میں اصحاب رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم میں سے بعض شخصیتیں جمع ہوئیں۔ معاویہ نے اپنی تقریر کا آغاز ہی حضرت علیؑ کو برا بھلا کہنے سے کیا،اسے امید تھی،کہ '' سعد و وقاص'' بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائے گا ۔

لیکن سعد نے معاویہ کی طرف رخ کرکے کہا : جب بھی مجھے حضرت علی علیہ السلام کی زندگی کے تین درخشان کارنامے یاد آتے ہیں تو صدق دل سے کہتا ہوں کہ کاش !ان تین فضیلتوں کا مالک میں ہوتا !اور یہ تین فضیلتیں حسب ذیل ہیں: ۱۔ جس دن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے علی علیہ السلام سے کہا '' :تمھیں مجھ سے وہ نسبت ہے جو ہاون کو موسیٰؑ سے تھی ، بجز اس کے کہ میرے بعد کوئی پیغمبر نہیں ہوگا ''

[1] غاية المرام ، ص ۱۰۷ ـ ۱۵۲۔
[2] المراجعات ، ص ۱۳۱۔ ۱۳۲
[3] صحيح بخارى ج ۳، ص ۵۸ ، صحيح مسلم ج ۲ ص ۳۲۳۔

۲۔ (پیغمبر اکرمؐ نے) جنگ خیبر کے دوران ایک دن فرمایا '': کل میں علم ایسے شخص کے ہاتھ میں دوں گا جسے خدا و رسولؐ دوست رکھتے ہیں اور وہ فاتح خیبر ہے ۔ فرار کرنے والا نہیں ہے'' (اس کے بعد آنحضرتؐ نے علم علیؑ کے ہاتھ میں دیدیا)۔

۳۔ '' نجران'' کے عیسائیوں کے ساتھ مباہلہ کے دن پیغمبر اکرمؐ نے علیؑ ، فاطمہؑ ، حسنؑ ، و حسینؑ کو اپنے گرد جمع کیا اور فرمایا'' :پروردگارا !یہ میرے اہل بیتؑ ہیں[1] ''لہذا پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے اس حدیث کے بیان کے بارے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں کرنا چاہئے ،بلکہ ایک قدم آگے بڑھ کر اس حدیث کی دلالت ، مفہوم اور مقصد کے بارے میں قدرے غور کرنا چاہئےپہلے مرحلہ میں جملہ '' الاّ انہ لا نبی بعدی'' قابل غور ہے کہ اصطلاح میں اسے '' جملۂ استثنائی ''کہا جاتا ہے ، معمولاً جب کسی کی شخصیت کو کسی دوسرے شخص کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں اورکہا جاتا ہے کہ یہ دونوں مقام و منزلت میں ہم پلہ ہیں ،تو اہل زبان اس جملہ سے اس کے سوا کچھ اور نہیں سمجھتے ہیں کہ یہ دو افراد اجتماعی شأن و منصب کے لحاظ سے آپس میں برابر ہیں ۔

اگر ایسی تشبیہ کے بعد کسی منصب و مقام کو استثناء ،قرار دیا جائے تو وہ اس امر کی دلیل ہوتا ہے کہ یہ دو افراد اس استثناء شدہ منصب کے علاوہ ہر لحاظ سے ایک دوسرے کے ہم رتبہ ہیں ۔اس حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اپنی ذات سے حضرت علی علیہ السلام کی نسبت کو حضرت ہارونؑ کو ، حضرت موسیؑ سے نسبت کے مانند بیان فرمایا ہے،اور صرف ایک منصب کو استثناء قرار دیا ہے ، وہ یہ ہے کہ حضرت ہارونؑ پیغمبر تھے لیکن پیغمبر اسلامؐ چونکہ خاتم النبیین ہیں لہذا آپؐ کے بعد کوئی پیغمبر نہیں ہوگا ۔ اور علیؑ پیغمبری کے مقام پر فائز نہیں ہوں گے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ قرآن مجید کے حکم کے مطابق حضرت ہارونؑ کے پاس وہ کون سے منصب تھے کہ حضرت علیؑ (بجز نبوت کے کہ خود پیغمبر نے اس حدیث کے ضمن میں اسے استثناء قرار دیا ہے) ان کے مالک تھے ۔ قرآن مجید کے مطالعہ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ نے خدائے تعالی سے حضرت ہارون کیلئے درج ذیل منصب چاہے تھےاور خدا نے حضرت موسیٰ کی درخواست منظور فرما کر وہ تمام منصب حضرت ہارونؑ کو عطا فرمائے تھے:۱۔ وزارت کا عہدہ : حضرت موسیٰ بن عمرانؑ نے خدائے تعالیٰ سے

---

[1] صحیح مسلم ، ج ۷ ص ۱۲۰۔

درخواست کی کہ حضرت ہارونؑ کو ان کا وزیر قراردے: (وَاجْعَلْ لِي وَزِيراً مِنْ أَهْلِي، هٰرُونَ أَخِي) '' پروردگارا! میرے اہل بیت میں سے میرے بھائی ہارون کو میرا وزیر قرار دیدے[1] ''

۲۔ تقویت و تائید: حضرت موسیٰؑ نے خدا سے درخواست کی کہ ان کے بھائی حضرت ہارونؑ کے ذریعہ ان کی تائید و تقویت فرمائے: (اُشْدُدْ بِهِ أَزْرِي) اس سے میری پشت کو مضبوط کردے[2]

۳۔ رسالت کا عہدہ: حضرت موسیٰ بن عمران نے خدائے تعالی سے درخواست کی کہ حضرت ہارونؑ کو امر رسالت میں ان کا شریک قرار دے: (وَ اَشْرِكْهُ فِي أَمْرِي[3]) اسے امر رسالت میں میرا شریک قرار دیدے۔ قرآن مجید اشارہ فرماتا ہے کہ خدائے تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کی تمام درخواستوں کا مثبت جواب دیکر یہ تمام عہدے حضرت ہارونؑ کو عطا کئے: (قَدْ اُوتِيتَ سُؤْلَكَ يٰمُوسَىٰ[4]) یعنی اے موسیٰ! بیشک تمہارے تمام مطالبات تمہیں عطا کردیے گئے اس کے علاوہ قرآن مجید ایک دوسری آیت میں حضرت ہارونؑ کی نبوّت کے بارے میں صراحت سے فرماتا ہے: (وَوَهَبْنَا لَهُ مِنْ رَحْمَتِنَآ أَخَاهُ هٰرُونَ نَبِيًّا[5]) اس کے علاوہ حضرت موسیٰؑ نے اپنی غیبت کے دوران بنی اسرائیل میں حضرت ہارونؑ کو اپنا جانشین مقرر کرتے ہوئے فرمایا: (وَ قَالَ مُوسىٰ لِأَخِيهِ هٰرُونَ اخْلُفْنِي فِي قَوْمِي) یعنی، موسی نے ہارون سے کہا: تم قوم میں میرے خلیفہ و جانشین ہو[6]۔ مذکورہ آیات کا مطالعہ کرنے پر ہارونؑ کے منصب اور عہدے بخوبی معلوم ہوتے ہیں اور حدیث منزلت کی رو سے مقام نبوت کے علاوہ یہ سب منصب اور عہدے حضرت علی علیہ السلام کیلئے ثابت ہونے چاہئیں۔ اس صورت میں حضرت علیؑ، امام، وزیر، ناصر و مددگار اور رسول خداؐ کے خلیفہ تھے اور پیغمبرؐ کی عدم موجودگی میں لوگوں کی رہبری و قیادت کے عہدہ دار تھے۔

---

[1] طٰہ / ۲۹۔۳۰۔
[2] طٰہ / ۳۱۔
[3] طٰہ / ۳۲
[4] ۴۔ طٰہ/ ۳۶
[5] مریم / ۵۳
[6] اعراف / ۱۴۲

ایک سوال کا جواب:

ممکن ہے یہ کہا جائے کہ حضرت علی علیہ السلام کیلئے پیغمبر اکرمؐ کی جانشینی انہیں ایام سے مخصوص تھی جب آپؐ مدینہ سے باہر تشریف لے گئے تھے ۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ حضرت علیؑ پیغمبر اسلامؐ کی رحلت کے بعد آپؐ کے مطلق خلیفہ اور جانشین تھے۔ لیکن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی زندگی کا ایک سرسری مطالعہ کرنے سے اس سوال کا جواب واضح ہوجاتا ہے۔ ۔ ایک اور آیت میں حضرت ہارون کی وزارت کے بارے میں صراحت سے فرماتا ہے:(وَجَعَلْنَا مَعَہُ اَخَاہُ ھٰرُونَ وَزِیراً)ہم نے موسی کے بھائی ہارون کو ان کا ویزر قرار دیا[1]'' ایک : حضرت علی علیہ السلام پہلے اور آخری شخص نہیں تھے۔ جنہیں پیغمبر اکرمؐ نے اپنی عدم موجودگی میں مدینہ میں اپنا جانشین قرار دیا ہو ۔ بلکہ پیغمبر اکرمؐ مدینہ منورہ میں اپنے دس سالہ قیام کے دوران، جب کبھی مدینہ سے باہر تشریف لے جاتے تھے تو کسی نہ کسی شخص کو اپنی جگہ پر جانشین مقرر کرکے ذمہ داریاں اسے سونپتے تھے اگر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اس جملہ کے ذریعہ امامؑ کو ہارون سے تشبیہ دینے کا مقصد صرف آپؐ کے مدینہ میں عدم موجودگی کے دوران امامؑ کی جانشینی تھا ،

تو پیغمبر اسلامؐ نے یہ جملہ اپنے دیگر جانشینوں کیلئے کیوں نہیں فرمایا ،جبکہ وہ لوگ بھی جب پیغمبرؐ جہاد یا حج خانہ خدا کیلئے مدینہ سے باہر تشریف لے جاتے ،آپ کے جانشین ہوا کرتے تھے ؟پھر اس فرق کا سبب کیا تھا؟دو: ایک مختصر مدت کیلئے حضرت علی علیہ السلام کو اپنا جانشین مقرر کرنے کی صورت میں پیغمبرؐ کو اس طرح تفصیلی جملہ بیان کرکے منصب رسالت کو اس سے مستثنیٰ قرار دینے کی ضرورت ہی نہیں تھی!اس کے علاوہ اس قسم کی جانشینی کسی خاص فخر کا سبب نہ ہوتی اور اگر فرض کرلیں کہ یہ ایک اعزاز تھا تو اس صورت میں یہ چیز حضرت علیؑ کے خاص فضائل میں شمار نہیں ہوتی کہ برسوں کے بعد سعد وقاص اس فضیلت کو سیکڑوں سرخ اونٹوں کے عوض خریدنے کی تمنا کرتا !اور خود حضرت علیؑ کے انتہائی اہم فضائل (فاتح خیبر اور نجران کے عیسائیوں کے ساتھ مباہلہ میں نفس پیغمبرؐ اور آپ کے اہل بیتؑ)کے مقام تک پہنچنے کی آرزو کرتا!!تین : اگر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے صرف جنگ تبوک کیلئے جانے کے موقع پر اس تاریخی جملہ کو بیان فرمایا ہوتا تو کسی کے ذہن میں ایسا سوال پیدا ہونا بجا تھا ۔ لیکن پیغمبر اسلامؐ نے امام علی علیہ السلام کے بارے میں یہ

---

[1] فرقان / ۳۵

اہم جملہ دیگر مواقع پر بھی فرمایا ہے اورتاریخ اور حدیث کے صفحات میں یہ واقعات ثبت و ضبط ہو چکے ہیں ۔ ہم یہاں پر اس کے صرف دو نمونوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اپنے دست مبارک کو حضرت علی علیہ السلام کے شانہ پر رکھ کر فرمایا ''یا علی انت اول المؤمنین ایماناً و اوّلھم اسلاماً ، و انت منّی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ''[2] ''اے علی! تم وہ پہلے شخص ہو جو مجھ پر ایمان لائے اور دین اسلام کو قبول کیا اور تم کو مجھ سے وہی نسبت ہے جو ہارون کو موسیٰ سے تھی ''

ہجرت کے ابتدائی ایام میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے مہاجرین و انصار کو جمع کیا اور انہیں آپس میں ایک دوسرے کا بھائی بنایا صرف حضرت علی علیہ السلام کو کسی کا بھائی قرار نہ دیا ۔ حضرت علیؑ کی آنکھوں میں آنسو آگئے ،آپؑ نے پیغمبرؐ سے عرض کی: یا رسول اللہ! کیا مجھ سے کوئی غلطی سرزد ہوئی ہے کہ آپؐ نے ہر فرد کیلئے ایک بھائی معین فرمایا،اور میرے لئے کسی کا انتخاب نہیں کیا؟ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے یہاں پر صحابیوں کے مجمع میں اپنا وہی تاریخی جملہ دہرایا '': وَ الذّی بعثنی بالحق ما اخرتک الا لنفسی و انت منی بمنزلۃ ھارون من موسی غیر انہ لا نبیّ بعدی و انت اخی و وارثی[3]'' ''قسم اس خدا کی جس نے مجھے حق پر مبعوث فرمایا ہے، میں نے تمہیں صرف اپنا بھائی بنانے بنانے کیلئے یہ تاخیر کی ہے،اور تم کو مجھ سے وہی نسبت ہے جو ہارونؑ کو موسیؑ سے تھی، بجز اس کے کہ میرے بعد کوئی پیغمبرؐ نہیں ہوگا ، تم میرے بھائی اور میرے وارث ہو''[4]حضرت علیؑ ان تمام عہدوں اور منصبوں کے مالک تھے جو حضرت ہارونؑ کو ملے تھے اس بات کی ایک اور دلیل یہ ہے کہ پیغمبر اسلامؐ خدا کے حکم سے مختلف طریقوں سے کوشش فرماتے تھے کہ لوگ اس سے آگاہ ہوجائیں کہ حضرت علیؑ کی حیثیت آپؐ کی نسبت وہی ہے جو ہارونؑ کی موسیؑ کی بنسبت تھی اور نبوت کے علاوہ اس میں کسی اور قسم کی کمی نہیں ہے۔

---

[1] ایک دن حضرت ابو بکر ، عمر اور ابو عبیدۃ بن جراح پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے۔
[2] کنز العمال ، ج ۶، ص ۳۹۵ ، حدیث نمبر ۶۰۳۲ ۔
[3] پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اس جملہ کو مختلف مواقع پر سات بار بیان فرمایا ہے ، لیکن ہم اختصار کی وجہ سے یہاں پر صرف دو مورد کا ذکر کرتے ہیں۔
[4] منتخب کنزل العمال (مسند کے حاشیہ میں) ج ۵، ص ۳۱

لہذا جب حضرت زہرا علیہا السلام سے حضرت علی علیہ السلام کے دو بیٹے پیدا ہوئے، تو پیغمبرؐ نے علیؑ کو حکم دیا کہ ان کے نام ''حسنؑ و حسینؑ'' رکھیں جیسا کہ ہارونؑ کے بیٹوں کے نام ''شبر و شبیر'' تھے کہ عربی زبان میں ان کا مطلب حسن و حسین ہوتا ہے ۔ ان دو جانشینوں (یعنی حضرت علیؑ اور حضرت ہارونؑ)کے بارے میں تحقیق و جستجو سے چند دیگر مشابہتوں کا سراغ بھی ملتا ہے ہم یہاں پر ان کے ذکر سے صرف نظر کرتے ہیں، مرحوم شرف الدین نے کتاب ''المراجعات'' میں اس سلسلے میں مفصل بحث کی ہے[1]۔ اسلام کی عالمی تحریک، ابتداء سے ہی قریش بلکہ جزیرہ نمائے عرب کے عام بت پرستوں کی طرف سے جنگ اور مخالفتوں سے روبرو ہوئی ۔ جو گوناگوں سازشوں کے ذریعہ اس شمع الٰہی کو بجھانے کے در پے تھے، لیکن تمام تر کوششوں کے باوجود کوئی خاص کامیابی حاصل نہ کر سکے۔ ان کی آخری خیالی امید یہ تھی کہ اس عظیم تحریک کے پائے اس کے پیشوا اور بانی کی وفات کے بعد اس طرح ڈھہ جائیں گے جس طرح پیغمبرؐ سے پہلے بعض لوگوں کی یکتا پرستی کی دعوت[2] ان کی وفات کے بعد خاموش ہوگئی۔

قرآن مجید جس نے اپنی بہت سی آیات میں ان کی سازشوں اور منصوبوں سے پردہ اٹھایا تھا اس دفعہ بت پرستوں کی آخری خیالی امید یعنی وفات پیغمبرؐ کے بارے میں درج ذیل آیت میں اشارہ فرماتا ہے: (أَمْ يَقُولُونَ شَاعِرٌ نَتَرَبَّصُ بِهِ رَيْبَ الْمَنُونِ { قُلْ تَرَبَّصُوا فَإِنِّي مَعَكُمْ مِنَ الْمُتَرَبِّصِينَ{أَمْ تَأْمُرُهُمْ أَحْلاَمُهُمْ بِهَذَا أَمْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُونَ[3]) ''یا یہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر شاعر ہے اور ہم اس کی موت کا انتظار کر رہے ہیں ۔ تو آپ کہہ دیجئے کہ بیشک تم انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں! کیا ان کی خام عقلیں انھیں اس بات پر آمادہ کرتی ہیںیا وہ واقعاً سرکش قوم ہیں''

مناسب ہے کہ یہا ں پر بت پرستوں کی طرف سے رسالتمابؐ کے ساتھ چھیڑی گئی بعض خائنانہ جنگوں اور روڑے اٹکانے کی منحوس حرکتوں کی ایک فہرست بیان کی جائے اور اس کے بعد دیکھا جائے کہ خدائے تعالیٰ نے ان کی آخری امیدوں کو کیسے ناکام بنایا اور آغوش پیغمبرؐ میں حضرت علیؑ جیسے لائق و شائستہ شخص کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے جانشین کی حیثیت سے منتخب کرکے ان کی

---

[1] المراجعات / ص ۱۴۱ ، ۱۴۷

[2] جیسے ، ورقۃبن نوفل جس نے عیسائی کتابوں کے مطالعہ کے بعد بت پرستی کو چھوڑ کر عیسائی مذہب قبول کرلیا تھا۔

[3] طور/ ۳۰ ۔۳۲

سازشوں کو خاک میں ملادیا ۔۱۔ تہمت کا حربہ کفار مکہ نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر شاعر، کاہن، دیوانہ اور جادوگر ہونے کی تہمتیں لگا کر یہ کوشش کی کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ارشادات کے اثرات کم کریں، لیکن سماج کے مختلف طبقوں میں اسلام کی نمایاں ترقی نے ثابت کر دیا کہ آپ کی مقدس ذات ان تہمتوں سے بالاتر تھی ۔

۲۔ آپ کے پیروؤں کو آزار پہچانا کفار مکہ کا ایک اور منصوبہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے پیرؤوں کو آزار پہنچانا اور انھیں جسمانی اذیتیں دینا اور قتل کرنا تھا تاکہ آپ کے ارشادات و ہدایت کے وسیع اثرات کو روک سکیں ۔ لیکن پیغمبر کے حامیوں کی ہر ظلم و جبر اور اذیت و آزار کے مقابلے میں استقامت و پامردی نے قریش کے سرداروں کو اپنے منحوس مقاصد تک پہنچنے میں ناکام بنادیا ۔ آنحضرت کے حامیوں کی آپ کے تئیں والہانہ عقیدت و اخلاص نے دشمنوں کو حیرت زدہ کر دیا، حتی ابو سفیان کہتا تھا، ''میں نے قیصر وکسریٰ کو دیکھا ہے لیکن ان میں سے کسی کو اپنے پیرؤوں کے درمیان محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم جیسا با عظمت نہیں دیکھا جن کے پیرؤوں نے ان کے مقاصد کی راہ میں اس قدر جاں بازی اور فداکاری کا ثبوت دیا ہے[1]

۳۔ عرب کے بڑے داستان گو کو دعوتقرآن مجید کے روحانی اور جذباتی اثرات سے کفار قریش حیرت زدہ تھے اور تصور کرتے تھے کہ قرآن مجید کی آیات کو سننے کیلئے لوگوں کا پروانہ وار دوڑنا اس سبب سے ہے کہ قرآن مجید میں گذشتہ اقوام کی داستانیں اور کہانیاں بیان ہوئی ہیں ۔ اس لئے کفار مکہ نے دنیائے عرب کے سب سے مشہور داستان گو ''نصر بن حارث'' کو دعوت دی کہ وہ خاص موقعوں پر مکہ کی گلی کوچوں میں 'ایران'' اور ''عراق'' کے بادشاہوں کے قصے سنائے تاکہ اس طرح لوگوں کو رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی طرف مائل ہونے سے روک سکیں !یہ منصوبہ اس قدر احمقانہ تھا کہ خود قریش یہ داستانیں سننے سے تنگ آچکے تھے اور اس سے دور بھاگتے تھے۔

[1] سیرہ ابن هشام ، ج ۲ ، ص ۱۷۲

۴۔ قرآن مجید سننے پر پابندی قریش کا ایک اور منحوس منصوبہ قرآن مجید سننے پر پابندی عائد کرنا تھا اس شمع الٰہی کے پروانوں کی استقامت سے ان کا یہ منصوبہ بھی خاک میں مل گیا ۔ قرآن مجید کی زبردست شیرینی اور دلکشی نے مکہ کے لوگوں کو اس قدر فریفتہ بنا دیا تھا کہ وہ رات کے اندھیرے میں گھروں سے نکل کر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے گھر کے اطراف میں چھپ جاتے تھے تا کہ جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نماز شب اور تلاوت قرآن مجید کیلئے اٹھیں تو وہ قرآن کی تلاوت سن سکیں ۔ قریش کے کفار صرف لوگوں کو قرآن سننے سے ہی منع نہیں کرتے تھے بلکہ لوگوں کو پیغمبرؐ سے ملنے جلنے سے منع کرتے تھے ۔ جب عرب کی بعض بزرگ شخصیتیں جیسے، اعشیٰ و طفیل بن عمر پیغمبرؐ سے ملنے کیلئے مکہ میں آئے تو قریش نے مختلف ذرایع سے ان کو پیغمبرؐ تک پہنچنے سے روک دیا [1]

۵۔اقتصادی پابندیکفار قریش نے ایک دستور کے ذریعہ لوگوں میں یہ اعلان کیا کہ کسی کو بنی ہاشم یا محمدؐ کے طرفداروں کے ساتھ لین دین کرنے کا حق نہیں ہے ۔ جس کی بنا پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اپنے ساتھیوں اور اعزّہ کے ساتھ ''شعب ابی طالبؑ'' میں پورے تین سال تک انتہائی سخت اور قابل رحم زندگی گزارنے پر مجبور ہوئے ۔ لیکن قریش کے بعض سرداروں کے اقدام اور بعض معجزات کے رونما ہونے کی وجہ سے یہ بائیکاٹ ختم ہوگیا ۔

۶۔ پیغمبر اکرمؐ کو قتل کرنے کی سازشقریش کے سرداروں نے یہ فیصلہ کیا کہ مختلف قبیلوں سے تعلق رکھنے والے قریش کے چالیس جوان رات کے اندھیرے میں پیغمبرؐ کے گھر پر حملہ آور ہوں اور آپؐ کو آپ کے بستر پر ہی ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالیں ۔ لیکن خداوند کریم (جو ہر وقت آپ کا حافظ و نگہبان تھا)نے پیغمبرؐ کو دشمنوں کی اس سازش سے آگاہ کردیا اور پیغمبر خداؐ نے خدا کے حکم سے حضرت علیؑ کو اپنے بستر پر سلا کر خود مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی ۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی مدینہ کی طرف ہجرت اور اوس و خزرج جیسے قبیلوں کا اسلام کی طرف مائل ہونا اس کا باعث ہوا کہ مسلمانوں کو ایک امن کی جگہ مل گئی اور پراکندہ مسلمان ایک پر امن جگہ پر جمع ہوکر دین کا دفاع کرنے کے لائق ہوگئے ۔

[1] سیرۃ ابن ھشام ، ج۱ ص ۳۸۶، ۴۱۰

۷۔ خونین جنگیںمسلمانوں کے مدینۃ منورہ میں اکٹھا ہونے اور حکومت اسلامی کی تشکیل کو دیکھتے ہوئے جزیرہ نمائے عرب کے بت پرست خوفزدہ ہوگئے اور اس دفعہ یہ فیصلہ کیا کہ ہدایت کی شمع فروزاں کو جنگ اور قتل و غارت کے ذریعہ ہمیشہ کیلئے بجھادیں ۔ اسی غرض سے کفار نے مسلمانوں سے بدر، احد ، خندق اور حنین کی خونین جنگیں لڑیں ۔ لیکن خدا کے فضل و کرم سے یہ جنگیں مسلمانوں کی فوجی طاقت میں اضافہ کا باعث بنیں اور انہوں نے بت پرستوں کو عرب میں ذلیل و خوار کرکے رکھدیا ۔

۸۔پیغمبر اسلامؐ کی وفات دشمنوں نے اپنے ناپاک عزائم کے سلسلے میں آخری امید پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی رحلت سے باندھی تھی ۔ وہ سوچ رہے تھے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی وفات کے ساتھ ہی اس تحریک کی بنیادیں اکھڑ جائیں گی اور اسلام کا بلند پایۂ محل زمین بوس ہوجائے گا ۔ اس مشکل کو دور کرنے اور اس سازش کو ناکام بنانے کیلئے دو راستے موجود تھے: ا۔ امت اسلامیہ کی فکری و عقلی نشو و نما اس حد تک پہنچ جائے کہ مسلمان پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی وفات کے بعد اسلام کی اس نئی تحریک کی عہد رسالت کے مانند ہدایت و رہبری کرسکیں اور اسے ہر قسم کے انحراف سے بچاتے ہوئے ''صراط مستقیم'' پر آگے بڑھائیں ۔پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی رحلت کے بعد امت کی ہمہ جہت قیادت کی سخت ضرورت تھی کیونکہ ابھی جو بد قسمتی سے امت کے افراد میں سازگار حالات نہیں پائے جاتے تھے ۔ اس وقت یہ مناسب نہیں ہے کہ ان حالات کے ہونے یا نہ ہونے پر مفصل بحث کریں، لیکن مختصر طور درج ذیل چند اہم نکات کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے:

الف) ایک ملت کی مختلف میدانوں میں ترقی اور بنیادی انقلاب کا پیدا ہونا چند روز یا چند سالوں میں ممکن نہیں ہوتا اور مختصر مدت میں ایسے مقاصد تک نہیں پہنچا جاسکتا ہے بلکہ انقلاب کی بنیادوں کو استحکام بخشنے اور اسے لوگوں کے دلوں کی گہرائیوں میں اتارنے کیلئے ایسے ممتاز اور غیر معمولی فرد یا افراد کی ضرورت ہوتی ہے جو اس تحریک کے بانی کی رحلت کے بعد امور کی باگ ڈور سنبھال سکیں اور انتہائی ہوشیاری اور پیہم تبلیغ کے ذریعہ سماج کو ہر قسم کے غلط رجحانات سے بچا سکیں تا کہ پرانی نسل کی جگہ ایک ایسی نئی نسل لے لے جو ابتداء سے ہی اسلامی آداب و اخلاق کے ماحول میں پلی ہو ۔ ورنہ دوسری صورت میں تحریک کے بانی کی وفات کے ساتھ ہی بہت سے لوگ

اپنی پرانی روش کی طرف پلٹ جائیں گے ۔اس کے علاوہ تمام الٰہی تحریکوں میں اسلام ایسی خصوصیت کا حامل تھا جس میں اس تحریک کے استحکام کیلئے ممتاز افراد کی اشد ضرورت تھی ۔ دین اسلام ایسے لوگوں کے درمیان وجود میں آیا تھا جو دنیا کی پسماندہ ترین قوم شمار ہوتے تھے اور اس معاشرہ کے لوگ سماجی و اخلاقی قواعد و ضوابط کے لحاظ سے انتہائی محرومیت کی حالت میں زندگی بسر کرتے تھے مذہبی آداب و رسوم کے طور پر وہ اپنے آباء و اجداد سے وراثت میں ملی ہوئی (جو خرافات اور برائیوں سے بھری تھیں) کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں جانتے تھے ۔ حضرت موسیؑ اور حضرت عیسیؑ کے دین نے ان کی سرزمین پر کوئی اثر نہیں ڈالا تھا اور حجاز کے اکثر لوگ اس سے محروم تھے اور اس کے مقابلہ میں جاہلیت کے عقائد اور رسم و رواج ان کے دلوں میں راسخ ہوکر ان کی روح میں آمیختہ ہوچکے تھے ۔ ممکن ہے کہ ایسے معاشروں میں مذہبی اصلاح زیادہ مشکل نہ ہو لیکن اس کا تحفظ اور اس کی بقا، ایسے لوگوں میں جن کی روح میں منفی عوامل نفوذ کرچکے ہوں، انتہائی مشکل کام ہوتا ہے اس کیلئے مسلسل ہوشیاری اور تدبیر کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ ہر قسم کے انحرافات اور رجعت پسندی کو روکا جا سکے ۔

''احد'' اور ''حنین'' کے دل دوز حوادث کے مناظر، جب گرما گرم جنگ کے دوران تحریک کے حامی رسالتآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو میدان کارزار میں تنہا چھوڑ کر باگ کھڑے ہوئے تھے اس بات کے واضح گواہ ہیں کہ تحریک کے مؤمن افراد ، جو اس کی راہ میں جان و مال کی قربانی دینے پر حاضر تھے، بہت کم تھے اور معاشرے کے زیادہ تر لوگ فکری و عقلی رشد و بلوغ کے لحاظ سے اس مقام پر نہیں پہنچے تھے کہ پیغمبر اسلامؐ نظام کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں دیدیتے اور دشمن کی آخری امید یعنی پیغمبر کی رحلت کے انتظار، کو ناکام بنادیتے ۔یہ وہی امت ہے جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی رحلت کے بعد اختلاف و تفرقہ کا مرکز بن گئی اور رفتہ رفتہ ۷۲ فرقوں میں بٹ گئی ۔ جو باتیں ہم نے اوپر بیان کیں اس سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ پیغمبر کی رحلت کے وقت فکری اور عقلی رشد کے لحاظ سے امت اسلامیہ اس حد تک نہیں پہنچی تھی کہ دشمنوں کے منصوبے ناکام ہوجاتے اسلئے کسی دوسری چارہ جوئی کی ضرورت تھی کہ ہم ذیل میں اس کی طرف اشارہ کرتے ہیں: ۲ ۔ تحریک کو استحکام بخشنے کیلئے آسان اور سادہ طریقہ یہ ہے کہ تحریک کے اصول و فروع پر ایمان

و اعتقاد کے لحاظ سے پیغمبرؐ جیسا ایک لائق و شائستہ شخص تحریک کی قیادت و رہبری کیلئے خدا ئے تعالیٰ کی طرف سے انتخاب کیا جائے اور وہ قوی ایمان، وسیع علم اور عصمت کے سائے میں انقلاب کی قیادت کو سنبھال کر اس کو استحکام اور تحفظ بخشے۔یہ وہی مطلب ہے جس کے صحیح اور مستحکم ہونے کا دعویٰ شیعہ مکتب فکر کرتا ہے ۔ اس سلسلے میں بہت سے تاریخی شواہد بھی موجود ہیں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے حجۃالوداع سے واپسی کے دوران ۱۸ ذی الحجۃ کو خدا کے حکم سے اس گتھی کو سلجھادیا اور خدا کی طرف سے اپنا جانشین اور ولی مقرر فرما کر اپنی رحلت کے بعد اسلام کو استحکام اور تحفظ بخشا۔اس کا واقعہ یوں ہے،کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ۱۰ھ میں حج بجالانے کیلئے مکہ کی طرف عزیمت فرمائی، چونکہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے حج کا یہ سفر آپؐ کی زندگی کا آخری سفر تھا اس لئے یہ حجۃالوداع کے نام سے مشہور ہوا ۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ساتھ شوق سے یاا حکام حج کو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے سیکھنے کیلئے جن لوگوں نے اس سفر میں آپؐ کا ساتھ دیا ان کی تعداد کے بارے میں مؤرخین نے ایک لاکھ بیس ہزار کا تخمینہ لگایا ہے ۔

حج کی تقریبات ختم ہوئیں اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم راہی مدینہ ہوئے جوق در جوق لوگ آپؐ کو الوداع کررہے تھے لیکن مکہ میں آپ سے ملحق ہونے والوں کے علاوہ سب آپؐ کے ہمسفر تھے ۔ کاروان، جحفہ سے تین کلو میٹر کی دوری پر ''غدیر خم'' کے ایک صحرا میں پہنچا ،اچانک وحی الٰہی نازل ہوئی اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو رکنے کا حکم ملا۔ پیغمبرؐ نے بھی حکم دیا کہ سب حجاج رک جائیں تا کہ پیچھے رہنے والے لوگ بھی پہنچ جائیں ۔پیغمبر کی طرف سے ایک تپتے ریگستان میں دوپہر کو تمازتِ آفتاب میں رکنے کے حکم پر لوگ تعجب میں تھے۔ اور سرگوشیاں کررہے تھے کہ ضرور خدا کی طرف سے کوئی خاص حکم پہنچا ہے اور اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ خدا کی طرف سے پیغمبرؐ کو امر ہوا ہے کہ وہ ان نامساعد حالات میں لوگوں کو روک کر فرمان الٰہی پہنچائیں۔ پیغمبر اکرمؐ کو یہ فرمان الٰہی درج ذیل آیۂ شریفہ کے ذریعہ ملا ۔ (یا أَیُّھا الرَّسُولُ بَلِّغْ ما أُنْزِلَ إِلَیْکَ مِنْ رَبِّکَ وَ إِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسالَتَہُ وَاللّٰہُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ[1]) ''اے پیغمبر !آپ اس حکم کو پہنچادیں جو آپ کے پروردگار کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اور اگر آپ نے

[1] مائده /۶۷

یہ نہ کیا تو گویا آپ خدا کی رسالت کو نہیں بجا لائے اور خدا آپ کو لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا ''اس آیۂ شریفہ کے مضمون پر غور کرنے سے ہمیں مندرجہ ذیل نکات کی طرف ہدایت ملتی ہے: اولاً: جس حکم الٰہی کو پہنچانے کی ذمہ داری پیغمبر اسلامؐ کو ملی تھی وہ اتنا اہم اور عظیم تھا کہ اگر پیغمبر اکرمؐ (بفرض محال) اسے پہنچانے سے ڈرتے اور نہ پہنچاتے تو گویا آپؐ نے اپنی رسالت کا کام ہی انجام نہیں دیا ہوتا ، بلکہ (آیندہ اس کی وضاحت کریں گے کہ) اس مأموریت کو بجالانے سے ہی آپؐ کی رسالت مکمل ہوتی ہے ۔ دوسرے الفاظ میں (ما أُنْزِلَ اِلَیکَ) (جو آپ پر نازل کیا گیا ہے) کا مقصود قرآن مجید کی تمام آیات اور احکام اسلامی نہیں ہو سکتے ہیں ،کیونکہ یہ بات بالکل واضح ہے کہ اگر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم احکام الٰہی نہ پہنچاتے تو اپنی رسالت کو انجام ہی نہ دیا ہوتا اور اس قسم کے بدیہی امر کے بارے میں کچھ کہنے اور آیت نازل کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی ،بلکہ اس کا مقصد ایک خاص موضوع کو پہنچانا ہے کہ اس کا پہنچانا رسالت پہنچانے کے برابر شمار ہوتا ہے اور جب تک اسے نہ پہنچا یا جائے ،رسالت کی عظیم ذمہ داری اپنے کمال تک نہیں پہنچتی ۔

اس بنا پر اس مأموریت کا مسئلہ اسلام کے اہم اصولوں میں سے ایک ہونا چاہئے جو اسلام کے دوسرے اصول و فروع سے پیوستہ ہو اور خدا کی وحدانیت اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی رسالت کی طرح یہ بھی ایک اہم مسئلہ ہو ۔ثانیاً : سماجی حالات اور ان کے محاسبات کے پیش نظر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم یہ گمان کرتے تھے کہ اس مأموریت کو انجام دینے کی صورت میں ممکن ہے لوگوں کی طرف سے آپؐ کو کوئی نقصان پہنچے ،اس لئے خدائے تعالیٰ نے آپؐ کے ارادہ کو قوت بخشنے کیلئے فرمایا : (وَ اللّٰہُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ) '' خدا آپؐ کو لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا ''اب یہ دیکھنا ہے کہ مفسرین اسلام نے اس آیت کے موضوع کے بارے میں جو احتمالات[1] جبکہ ان کا کوئی صحیح ماخذ بھی نہیں ہے ـــــ مذکورہ دو شرائط کا حامل نہیں ہے ،جنہیں ہم نے مذکورہ آیت سے اس کے موضوع کے تحت بیان کیا ہے ،ان میں سے زیادہ تر احتمالات ہرگز اس قدر اہم نہیں ہیں کہ ان کے نہ پہنچانے پر رسالت کو کوئی نقصان پہنچتا یا

[1] فخرر ازی نے اپنی تفسیر (ج۳، ص ۶۳۵) میں پیغمبر ؐ کی اس ماموریت کے بارے میں دس احتمالات بیان کئے ہیں جب کہ ان میں سے ایک احتمال بھی ـــــ

پیغامات کا پہنچانا خوف و وحشت کا سبب بن جاتا یہ احتمالات حسب ذیل ہیں: ا۔ یہ آیت، گناہگار مردوں اور عورتوں کو سنگسار کرنے کے بارے میں ہے۔

۲۔ یہ آیت، یہودیوں کے پیغمبرؐ پر اعتراض کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

۳۔ جب قرآن مجید نے پیغمبرؐ کی بیویوں کو تنبیہ کی کہ اگر وہ دنیا کے زر و زیور کو چاہیں گی تو پیغمبرؐ ان کو طلاق دیدیں گے، پیغمبرؐ E بیان کئے ہیں ان میں سے کون سا احتمال اس آیۂ شریفہ کے مضمون سے قریب تر ہے۔ شیعہ محدثین کے علاوہ اہل سنت محدثین کے تیس[1] افراد نے لکھا ہے کہ یہ آیہ شریفہ غدیر کے دن نازل ہوئی ہے، جس دن خدا نے پیغمبرؐ کو مامور کیا کہ علیؑ کو ''مؤمنین کے مولا'' کے طور پر پہچنوائیں۔ امت پر پیغمبرؐ کی جانشینی کے عنوان سے امامؑ کی قیادت کا مسئلہ ہی اتنا ہی اہم اور سنجیدہ تھا کہ اس کا پہنچانا رسالت کی تکمیل کا باعث اور نہ پہنچانا رسالت کے نقصان اور رسول کی زحمتوں کے F اس حکم الٰہی کو پہنچانے سے ڈرتے تھے کہ کہیں وہ دنیا کو ترجیح نہ دیں۔

۴۔ یہ آیت، پیغمبرؐ کے منہ بولے بیٹے زید کے واقعہ سے متعلق ہے کہ پیغمبرؐ کو خدا کی طرف سے حکم ہوا کہ وہ زید کی طلاق یافتہ بیوی سے شادی کرلیں۔

۵۔ یہ آیت لوگوں اور منافقین کو جہاد کی طرف دعوت دینے سے مربوط ہے۔

٦۔ بتوں کی برائی کرنے سے پیغمبرؐ کی خاموشی سے مربوط ہے۔

۷۔ یہ آیت حجۃ الوداع میں اس وقت نازل ہوئی ہے جب پیغمبرؐ شریعت اور مناسک بیان فرمارہے تھے۔

۸۔ پیغمبرؐ قریش، یہود اور نصاری سے ڈرتے تھے اس لئے یہ آیت آپؐ کے ارادے کو قوت بخشنے کیلئے نازل ہوئی ہے۔

---

[1] مرحوم علامہ امینی نے ان تیس افراد کے نام اور خصوصیات اپنی تالیف، الغدیر، ج ۱، ص ۱۹۶ ۔ ۲۰۹۔میں مفصل بیان کئے ہیں ان میں، طبری، ابو نعیم اصفہانی، ابن عساکر، ابو اسحاق حموینی اور جلال الدین سیوطی وغیرہ جیسے افراد بھی شامل ہیں کہ انہوں نے ابن عباس، ابو سعید خدری اور براء بن عازب سے یہ حدیث نقل کی ہے۔

۹ ۔ ایک جنگ میں جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ایک درخت کے سایہ میں آرام فرمارہے تھے ،ایک عرب ننگی تلوار لے کر پیغمبرؐ پر حملہ آور ہوا اور آپؐ سے مخاطب ہوکر کہا : ''اب تمہیں مجھ سے کون بچا سکتا ہے''، پیغمبرؐ نے جواب میں فرمایا : ''خدا'' اس وقت دشمن پر خوف طاری ہوا وہ پیچھے ہٹ گیا اور اس کا سر درخت سے ٹکرا کر پھٹ گیا ،اس وقت یہ آیت نازل ہوئی (واللہ یعصمک من الناس) آیہ شریفہ کے مفاد کا مذکورہ احتمالات کے مطابق ہونا (مثلاً آخری احتمال) بہت بعید ہے جب کہ غدیر خم کے واقعہ کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے تباہ ہوجانے کا سبب شمار ہوتا ۔اسی طرح پیغمبر اکرمؐ کا اجتماعی محاسبات کے پیش نظر خوف و تشویش سے دوچار ہونا بجا تھا،کیونکہ حضرت علیؑ جیسے صرف ۳۳ سالہ شخص کا جانشین اور وصی قرار پانا اس گروہ کیلئے انتہائی سخت اور دشوار تھا جو عمر کے لحاظ سے آپؑ سے کہیں زیادہ بڑے تھے[1] اس کے علاوہ ایسے افراد بھی مسلمانوں کی صفوں میں موجود تھے جن کے اسلاف مختلف جنگوں میں حضرت علیؑ کے ہاتھوں قتل ہوچکے تھے اور قدرتی طور وہ کینہ توز ایسے شخص کی حکومت کی شدید مخالف کرتے ۔

اس کے علاوہ حضرت علیؑ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے چچا زاد بھائی اور داماد بھی تھے،اور تنگ نظر لوگوں کی نظر میں ایسے شخص کو خلافت کے عہدہ پر مقرر کرنا اس کا سبب ہوتا کہ وہ اس عمل کو کنبہ پروری تصور کرتے ۔لیکن ان تمام ناسازگار حالات کے باوجود خدائے تعالی کا حکیمانہ ارادہ یہی تھا کہ رسولؐ کا جانشین مقرر فرما کر اسلامی تحریک کو تحفظ بخشے اور اپنے نبیؐ کی عالمی رسالت کا رہبر و راہنما مقرر کرکے اسے تکمیل تک پہنچائے۔اب اس تاریخی واقعہ کی تفصیل ملاحظہ فرمائیں۱۸،ذی الحجۃ کی دوپہر کا وقت تھا ، سورج کی تمازت نے غدیر خم کی سرزمین کو جھلسا رکھا تھا ۔ لوگوں کی ایک بڑی تعداد جس کے بارے میں ۷۰ ہزار سے ۱۲۰ ہزار تک لکھا گیا ___ پیغمبرؐ کے حکم سے وہاں پر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھی اور یہ لوگ اس دن رونما ہونے والے تاریخی واقعہ کا انتظار کررہے تھے۔ گرمی کی شدت کا یہ عالم تھا کہ ،لوگوں نے اپنی ردائیں تہ کرکے آدھی سر پر اور آدھی پاؤں کے نیچے رکھی تھیں ۔ان حساس لمحات میں اذان ظہر کی آواز سے تمام صحرا گونج اٹھا ،اور لوگ نماز ظہر کیلئے آمادہ ہوئے ،پیغمبر اکرمؐ نے اس عظیم اور پرشکوہ اجتماع ___ کہ سرزمین غدیر پہ ایسا

[1] خاص طور پر عرب قوم میں ہمیشہ بڑے عہدوں کو قبیلہ کے عمر رسیدہ لوگوں کے سپرد کرنے کی رسم تھی اور جوانوں کو اس بہانے سے ایسے عہدے سونپنے کے قائل نہ تھے کہ جو ان زمانہ کا تجربہ نہیں رکھتے ہیں ۔ لہذا جب پیغمبر ؐ نے " عتاب بن ولید'' کو مکہ کا گورنر اور اسامہ کو سپہ سالار مقرر فرمایا تو عمر رسیدہ لوگوں نے آپ ؐ پر اعتراض کیا پھر لوگ اس امر کی طرف توجہ نہیں دیتے کہ حضرت علی ؑ دیگر جوانوں سے مختلف ہیں ، یہ لائق اور شائستہ شخص الہی عنایتوں کے سایہ میں ایسے مقام تک پہنچا ہوا ہے کہ ہر قسم کی خطا اور لغزشوں سے محفوظ ہے اور ہمیشہ عالم بالا سے امداد حاصل کرتاہے۔

عظیم نہیں ہوا تھا ـــ کے ساتھ نماز ظہر ادا کی ۔ اس کے بعد آپ لوگوں کے درمیان تشریف لائے اور اونٹوں کے پالان سے بنے ایک بلند منبر پر جلوہ افروز ہوکر بلند آواز سے خطبہ دینا شروع کیا اور فرمایا ''حمد و ستائش تنہا خدا کے لئے ہے، ہم اسی سے مدد چاہتے ہیں اور اسی پر ایمان رکھتے ہیں، اور اسی پر توکل کرتے ہیں، اور اپنے نفس امارہ اور برائی کے شر سے محفوظ رہنے کیلئے اس خدا کی پناہ لیتے ہیں، جس کے سوا گمراہوں کی ہدایت و راہنمائی کرنے والا کوئی نہیں ہے ۔

ہم گواہی دیتے ہیں کہ جس کی خداوند کریم ہدایت کرے کوئی اسے گمراہ نہیں کرسکتا ہم اس خدا کی گواہی دیتے ہیں جس کے علاوہ کوئی خدا نہیں ہے اور محمدؐ خدا کا بندہ اور اس کا رسولؐ ہے ۔اے لوگو! خدائے لطیف و خبیر نے مجھے خبر دی ہے کہ ہر پیغمبر کی رسالت کی مدت اس سے پہلے کی رسالت کی آدھی ہوتی ہے، اور میں جلدی ہی دعوت حق کو لبیک کہنے والا اور تم سے رخصت ہونے والا ہوں، میں ذمہ دار ہوں اور تم لوگ بھی ذمہ دار ہو، میرے بارے میں کیا سوچتے ہو؟اصحاب رسولؐ نے کہا: ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپؐ نے دین خدا کی تبلیغ کی، ہمارے بارے میں خیر خواہی کی اور ہماری نصیحت فرمائی اور اس راہ میں سعی و کوشش کی، خدائے تعالی آپ کو جزائے خیر عطا کرے ۔

مجمع پر خاموشی چھاگئی تو پیغمبرؐ نے فرمایا: کیا تم لوگ گواہی نہیں دیتے ہو کہ خدا کے سوا کوئی خدا نہیں ہے اور محمدؐ خدا کا بندہ اور اس کا رسولؐ ہے، جنت، جہنم اور موت حق ہے ۔ بے شک قیامت آئے گی اور خدائے تعالی زمین میں دفن لوگوں کو پھر سے زندہ کرے گا ؟اصحاب رسولؐ: جی ہاں! جی ہاں! ہم گواہی دیتے ہیں ۔پیغمبرؐ: میں تم لوگوں کے درمیان دو گراں قدر چیزیں چھوڑ رہا ہوں تم لوگ ان کے ساتھ کیسا برتاؤ کرو گے؟ایک شخص: یہ دو گراں قدر چیزیں کیا ہیں ؟پیغمبرؐ: ثقل اکبر خدا کی کتاب ہے کہ اس کا ایک سرا خدا سے وابستہ اور دوسرا سرا تمہارے ہاتھ میں ہے، خدا کی کتاب کو مضبوطی سے پکڑے رہو تا کہ گمراہ نہ ہو اور ''ثقل اصغر'' میری عترت اور اہل بیتؑ ہیں ۔ خدا نے مجھے خبر دی ہے کہ میری یہ دو یادگاریں قیامت تک ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گی۔ خبردار، اے لوگو: خدا کی کتاب اور میری عترت سے آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرنا اور نہ ان سے پیچھے رہنا تا کہ نابودی سے بچے رہو۔

اس موقع پر پیغمبرؐ نے علیؑ کا ہاتھ پکڑ کر انھیں اس قدر بلند کیا کہ آپؐ کے بغل کے نیچے کی سفیدی نمایاں ہوگئی اور تمام لوگوں نے علیؑ کو پیغمبرؐ کے پہلو میں دیکھا اور انھیں اچھی طرح سے پہچان لیا ۔ سب سمجھ گئے کہ اس اجتماع کا مقصد، علیؑ سے مربوط کوئی اعلان ہے ۔ سب شوق و بے تابی کے ساتھ پیغمبرؐ کی بات سننے کے منتظر تھے ۔ پیغمبرؐ: اے لوگو! مؤمنوں پر ، خود ان سے زیادہ سزاوار کون ہے ؟ اصحاب پیغمبرؐ: خدا اور اس کا پیغمبرؐ بہتر جانتے ہیں ۔

پیغمبرؐ: '' خدا میرا مولا اور میں مؤمنوں کا مولا اور ان پر ، خود ان سے زیادہ اولی و سزاوار ہوں ۔ اے لوگو ! '' من کنت مولاہ فعلی مولاہ '' یعنی جس جس کا میں مولا خود اس سے زیادہ اس پر سزاوار ہوں اس کے علیؑ بھی مولا ہیں '' اور پیغمبرؐ نے اس جملہ کو تین بار فرمایا[1] اس کے بعد فرمایا : پروردگارا ! اس کو دوست رکھ ، جو علیؑ کو دوست رکھے اور اس کو دشمن رکھ جو علیؑ سے دشمنی کرے ۔ خدایا ! علیؑ کے دوستوں کی مدد فرما اور اس کے دشمنوں کو ذلیل و خوار فرما ۔ خداوندا ! علیؑ کو مرکز حق قرار دے ''

اس کے بعد پیغمبر نے فرمایا : ضروری ہے کہ اس جلسہ میں حاضر لوگ اس خبر کو غیر حاضروں تک پہنچا دیں اور دوسروں کو بھی اس واقعہ سے باخبر کریں ۔ ابھی غدیر کا اجتماع برقرار تھا کہ فرشتۂ وحی تشریف لایا اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو بشارت دی کہ خداوند کریم فرماتا ہے : میں نے آج اپنے دین کو مکمل کردیا اور اپنی نعمتیں تم پر تمام کردیںاور اس پر راضی ہوا کہ یہ کامل شدہ اسلام تمہارا دین ہو[2] یہاں پر پیغمبر اسلام نے تکبیر کی آواز بلند کرتے ہوئے فرمایا : میں خدا کا شکر گزار ہوں کہ اس نے اپنے دین کو مکمل کردیا اور اپنی نعمت تمام کردی اور میری رسالت اور میرے بعد علیؑ کی ولایت پر خوشنود ہوا ۔

اس کے بعد پیغمبرؐ اپنی جگہ سے نیچے تشریف لائے ، آپؐ کے اصحاب گروہ گروہ آگے بڑھے اور علیؑ کو مبارکباد دی اور انہیں اپنے اور تمام مؤمنین و مومنات کا مولا کہا ۔ اس موقع پر رسول خداؐ کا شاعر '' حسان بن ثابت '' اٹھا اور اس نے اس تاریخی روداد کو شعر کی صورت میں بیان کرکے اسے ابدی رنگ دیدیا ۔ اس کے اس قصیدہ سے صرف دو ابیات کا ترجمہ یہاں پر ذکر کرتے ہیں :

---

[1] احمد بن حنبل کا کہنا ہے کہ پیغمبرؐ نے اس جملہ کو چار بار فرمایا

[2] (اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِینَکُمْ وَ أَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِی وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْإِسْلاَمَ دِینًا) مائدہ/ ۳

''پیغمبرؐ نے علیؑ سے فرمایا : کھڑے ہوجاؤ! میں نے تمہیں اپنے بعد لوگوں کی قیادت اور راہنمائی کیلئے منتخب کیا ہے[۱]۔ جس کا میں مولا ہوں، اس کے علیؑ بھی مولا ہیں ۔ لوگو! تم لوگوں پر لازم ہے کہ علیؑ کے سچے اور حقیقی دوست رہو ۔ اوپر بیان شدہ روداد غدیر کے واقعہ کا خلاصہ ہے جو اہل سنت علماء کے اسناد و مآخذ میں ذکر ہوا ہے ۔ شیعوں کی کتابوں میں یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے ۔ مرحوم طبرسی نے اپنی کتاب '' احتجاج '' میں پیغمبرؐ خدا سے ایک مفصل خطبہ نقل کیا ہے ، شائقین اس کتاب میں اس خطبہ کا مطالعہ کر سکتے ہیں[۲]

غدیر کا واقعہ لافانی و جاویدانی ہے:

خدائے تعالیٰ کا حکیمانہ ارادہ یہی تھا کہ غدیر کا تاریخی واقعہ تمام زمانوں اور صدیوں میں ایک زندہ تاریخ کی صورت میں باقی رہے تا کہ ہر زمانے کے لوگ اس کی طرف جذب ہوں اور ہر زمانے میں اسلام کے اہل قلم تفسیر ، حدیث ، کلام اور تاریخ پر قلم اٹھاتے وقت اس موضوع پر لکھیں اور مذہبی مقررین ، وعظ و سخن کی مجلسوں میں اسے بیان کرتے ہوئے اس کو امامؑ کے ناقابل انکار فضائل میں شمار کریں ۔ ادباء و شعراء بھی اس واقعہ سے الہام حاصل کرکے اپنے ادبی ذوق و شوق کو اس واقعہ سے مزین کرکے مولا کے تئیں اپنے جذبات مختلف زبانوں میں بہترین ادبی نمونوں کی صورت میں پیش کریں ۔ یہ بات بلا سبب نہیں کہ انسانی تاریخ میں بہت کم ایسے واقعات گزرے ہیں جو واقعہ غدیر کی طرح علماء ، محدثین ، مفسرین ، متکلمین ، فلاسفہ ، مقررین ، شعراء ، مؤرخین و سیرت نگاروں کی توجہ کا مرکز بنے ہیں ان سب نے اس واقعہ کو قدر کی نگاہ سے دیکھا اور عقیدت کے پھول نچھاور کئے ہیں ۔ بیشک اس واقعہ کے لافانی اور جاویدانی ہونے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اس واقعہ سے مربوط قرآن مجید میں دو آیتیں نازل ہوئی ہیں ۔ چونکہ قرآن لافانی اور ابدی ہے اس لئے یہ واقعہ بھی لافانی ہوگیا ہے اور ہرگز ختم ہونے والا نہیں ہے ۔ اس کے علاوہ چونکہ گزشتہ زمانہ میں اسلامی معاشرہ اور آج کا شیعہ معاشرہ اس روز کو مذہبی عیدوں میں ایک عظیم عید شمار کرتا ہے اور اس مناسبت سے ہر سال با شکوہ تقریبات منعقد کرتا ہے لہذا قدرتی طور پر غدیر کے

[۱] فقال لہ قم یا علی فاننی رضیتک من بعدی اماماً و ھادیافمن کنت مولاہ فھذا ولیہ فکونو لہ اتباع صدق موالیا
[۲] احتجاج طبرسی ، ج ۱ ص ۷۱ تا ۷۴ طبع ، نجف ۔

تاریخی واقعہ نے ابدیت کا رنگ اختیار کرلیا ہے اور کبھی فراموش ہونے والا نہیں ہے۔ ا۔ آیۂ، (یا أیُّھا الرَّسول بَلّغ ما أُنزِلَ إلیکَ مِن رَبّکَ[1]) ،اور آیۂ شریفہ (اَلیَومَ اَکمَلتُ لَکُم دِینَکُم وَ أتمَمتُ عَلَیکُم نِعمَتِی[2]) تاریخ کا مطالعہ کرنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۸ ذی الحجۃ الحرام کا دن مسلمانوں کے درمیان عید غدیر کے طور پر معروف تھا ،یہاں تک کہ '' ابن خلکان '' فاطمی خلیفہ مستعلی بن المستنصر کے بارے میں لکھتا ہے '': سن ۴۸۷ھ عید غدیر کے دن، کہ ۱۸ ذی الحجۃ الحرام ہے، لوگوں نے اس کی بیعت کی[3] المستنصر باللہ کے بارے میں '' العبیدی'' لکھتا ہے '':وہ سن ۴۸۷ھ میں جب ماہ ذی الحجۃ میں ۱۲ شبیں باقی بچی تھیں، فوت ہوا ،یہ شب وہی ۱۸ ویں ذی الحجۃ کی شب ہے،اور شب عید غدیر ہے[4]'' ابن خلکان نے ہی اس شب کو عید غدیر کی شب کا نام نہیں دیا ہے بلکہ '' معودی[5]'' اور '' ثعالبی[6]'' نے بھی اس شب کوامت اسلامیہ کی مشہور و معروف شبوں میں شمار کیا ہے۔

عید غدیر کے دن جشن و سرور کی تقریبات کا سلسلہ اس دن خود پیغمبرؐ کے عمل سے شروع ہوا ہے۔ کیونکہ اس دن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے مہاجرین و انصار بلکہ اپنی بیویوں کو بھی حکم دیا تھا کہ علیؑ کے پاس جاکر انہیں اس عظیم فضیلت کی مبارکباد دیں۔ زید بن ارقم کہتے ہیں : مہاجرین میں سے سب سے پہلے جن افراد نے علیؑ کے ہاتھ پر بیعت کی،ابوبکر ، عمر، عثمان، طلحہ اور زبیر تھے اور مبارکبادی یہ تقریب اس دن سورج ڈوبنے تک جاری رہی۔

واقعہ کی لافانیت کے دیگر دلائل:

اس تاریخی واقعہ کی اہمیت کیلئے اتنا ہی کافی ہے کہ ۱۱۰ صحابیوں نے اسے نقل کیا ہے ۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اتنی بڑی جمعیت میں سے صرف ان ہی افراد نے غدیر کے واقعہ کو نقل کیا ہے،بلکہ سنی علماء کی کتابوں میں اس واقعہ کے صرف ۱۱۰ راوی ذکر ہوئے ہیں ۔ یہ بات صحیح ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ایک لاکھ کے مجمع میں تقریر فرمائی، لیکن ان میں بہت سے لوگ

[1] مائده / ۶۷
[2] مائده /۳
[3] وفیات الاعیان ، ج۱، ص ۶۰ ۔
[4] وفیا ت الاعیان ، ج۱، ص ۲۲۳۔
[5] التنبیه و الاشراف ، ص ۲۲ ۔
[6] ثمارة القلوب ، ص ۵۱۱۔

حجاز سے دور دراز کے علاقوں سے تعلق رکھنے والے تھے، جن سے کوئی حدیث نقل نہیں ہوئی ہے، یا اگر نقل ہوئی بھی ہو تو ہم تک نہیں پہنچی ہے۔ ان میں سے اگر کسی جماعت نے اس واقعہ کو نقل بھی کیا ہے تو تاریخ ان کے نام درج کرنے میں کامیاب نہیں ہوئی۔ دوسری صدی ہجری میں جو عصر تابعین کے نام سے مشہور ہے نواسی افراد نے اس حدیث کو نقل کیا ہے۔ بعد والی صدیوں میں حدیث کے بہت سے راوی سنی علماء تھے ان میں سے تین سو ساٹھ راویوں نے اس حدیث کو اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے اور ان میں سے بہت سے لوگوں نے اس حدیث کے صحیح اور محکم ہونے کا اعتراف بھی کیا ہے۔

تیسری صدی ہجری میں ۹۲ (بانبے) سنی علماء نے، چوتھی صدی میں تینتالیس (۴۳)، پانچویں صدی میں چوبیس (۲۴)، چھٹی صدی میں بیس (۲۰)، ساتویں صدی میں اکیس (۲۱)، آٹھویں صدی میں اٹھارہ (۱۸)، نویں صدی میں سولہ (۱۶)، دسویں صدی میں (۱۴) چودہ، گیارھوں صدی میں بارہ (۱۲)، بارہویں صدی میں تیرہ (۱۳)، تیرھویں صدی میں بارہ (۱۲) اور چودھویں صدی میں بیس (۲۰) سنی علماء نے اس حدیث کو نقل کیا ہے۔ مذکورہ علماء کی ایک جماعت نے اس حدیث کی نقل پر ہی اکتفاء نہیں کی ہے بلکہ اس کے اسناد اور مفہوم پر مخصوص کتابیں لکھی ہیں۔ عالم اسلام کے عظیم اور نامور تاریخ دان، طبری نے ''الولایۃ فی طرق حدیث الغدیر'' کے موضوع پر کتاب لکھی ہے اور اس میں اس حدیث کو ستر (۷۰) سے زیادہ طریقوں سے، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے نقل کیا ہے۔ ابن عقدہ کوفی نے اپنے رسالہ ''ولایت'' میں اس حدیث کو ایک سو پچاس (۱۵۰) افراد سے نقل کیا ہے۔ جن افراد نے اس تاریخی واقعہ کی خصوصیات کے بارے میں مخصوص کتابیں لکھی ہیں، ان کی تعداد چھبیس (۲۶) ہے۔ ممکن ہے اس سے زیادہ افراد ہوں جنہوں نے اس موضوع پر کتابیں یا مقالات لکھے ہیں لیکن تاریخ میں ان کا نام درج نہیں ہوا ہے یا ہماری رسائی ان تک نہیں ہے۔ شیعہ علماء نے بھی اس تاریخی واقعہ پر گراں بہا کتابیں لکھی ہیں کہ ان تمام کتابوں میں جامع ترین اور تاریخی کتاب علامہ مجاہد مرحوم آیت اللہ امینیؒ کی کتاب ''الغدیر'' ہے۔ ہم نے امامؑ کی زندگی کے اس پہلو کے بارے میں ان کی اس کتاب سے کافی استفادہ کیا ہے۔ گزشتہ بحثوں سے اچھی طرح واضح اور ثابت ہوگیا کہ غدیر کا واقعہ قطعی اور یقینی طور پر ایک تاریخی واقعہ ہے اور اس میں کسی قسم کا

شک و شبہہ کرنا بدیہی امور میں شک کرنے کے مترادف ہے ۔ اسلامی احادیث میں شاید ہی کوئی ایسی حدیث ہو جو متواتر اور قطعی ہونے کے لحاظ سے اس حدیث کی برابری کر سکے ۔ اس لئے ہم اس کی سند کے بارے میں مزید بحث و گفتگو نہیں کریں گے،بلکہ اب اس کے مفاد و مفہوم کی وضاحت کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس حدیث کو سمجھنے کی کنجی یہ ہے کہ جملۂ ''من کنت مولاہ فعلی مولاہ'' میں وارد شدہ لفظ ''مولیٰ''، کو سمجھ لیں اس لفظ کے معنی کو سمجھنے کے بعد قدرتی طور پر حدیث کا مفہوم بھی واضح ہوجائے گا ۔

سب سے پہلے یہ امر قابل غور ہے کہ قرآن مجید میں لفظ ''مولیٰ''، ''اولی'' اور ''ولی'' کے معنی میں استعمال ہوا ہے، جیسے:۱۔ (فَالْیَومَ لَا یُؤْخَذُ مِنْکُمْ فِدْیَۃٌ وَ لَا مِنَ الَّذِینَ کَفَرُوا مَأْوَاکُمُ النَّارُ ھِیَ مَوْلٰکُمْ وَ بِءسَ الْمَصِیْرُ)تو آج (قیامت کے دن) نہ تم سے کوئی فدیہ یا عوض لیا جائے گا اور نہ کفار سے ، تم سب کا ٹھکانا جہنم ہے وہی تم سب کا صاحب اختیار (مولا) ہے اور تمہارا بدترین انجام ہے[۱]۔ اسلام کے بڑے اور نامور مفسرین اس آیۂ شریفہ کی تفسیر میں کہتے ہیں : اس آیت میں ''مولیٰ'' کا لفظ ''اولی'' کے معنی میں ہے، کیونکہ یہ افراد ، جو ناشائستہ اور برے اعمال کے مرتکب ہوئے ہیں تو ان کیلئے ان اعمال کے عوض جہنم کی آگ کے سوا کوئی اور چیز سزاوار نہیں ہے[۲]۔

۲۔ (یَدْعُوا لَمَنْ ضَرُّہُ أَقْرَبُ مِنْ نَفْعِہِ لَبِءسَ الْمَوْلٰی وَ لَبِءسَ الْعَشِیْرُ) ''یہ اس بت کو پکارتا ہے جس کا نقصان اس کے فائدے سے زیادہ قریب تر ہے وہ اس کا بدترین سرپرست (ولی) اور بدترین ساتھی ہے[۳]۔ یہ آیۂ شریفہ اپنے مضمون اور گزشتہ آیات کے قرینہ کی روشنی میں مشرکوں اور بت پرستوں کے عمل سے متعلق ہے کہ وہ بتوں کو اپنا صاحب اختیار (ولی) جانتے تھے اور اسے اپنے سرپرست (ولی) کی حیثیت سے مانتے تھے اور ''ولی'' کی حیثیت سے ہی ان کو پکارتے تھے۔ ان دو آیتوں اور اسی طرح دوسری آیات _ جن کے ذکر سے ہم صرف نظر کرتے ہیں _ سے اجمالی طور سے ثابت ہوتا ہے کہ ''مولیٰ'' کے معنی وہی ''اولیٰ'' اور ''ولی'' کے ہیں ۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ جملہ ''من کنت مولاہ فھذا علی مولاہ'' کا مقصد کیا ہے ؟ کیا اس کا مقصد وہی نفوس پر تصرف رکھنے

---

[۱] حدید/ ۱۵

[۲] ای اولی لکم ما اسلفتم من الذنوب۔

[۳] حج / ۱۳۔

میں اولیٰ ہونا ہے جس کا لازمہ کسی شخص کا انسان پر ولایت مطلقہ رکھنا ہے یا حدیث کا مفہوم کچھ اور ہے، جیسا کہ بعض لوگوں نے تصور کیا ہے کہ حدیث غدیر میں '' مولیٰ '' دوست اور ناصر کے معنی میں ہے۔ بے شمار قرائن اس کے گواہ ہیں کہ '' مولیٰ '' سے مراد وہی پہلا معنی ہے جسے علماء اور دانشوروں نے ولایت مطلقہ سے تعبیر کیا ہے اور قرآن مجید نے خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بارے میں فرمایا ہے :(اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِینَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ[1]) بیشک نبی تمام مؤمنین سے ان کے نفوس کی نسبت زیادہ اولیٰ ہے۔

اگر کوئی شخص (تسلط اور تصرف کے لحاظ سے) کسی کی جان پر خود اس سے زیادہ شائستہ و سزاوار ہو تو وہ قدرتی طور پر اس کے مال پر بھی یہی اختیار رکھتا ہوگا۔ اور جو شخص کسی انسان کی جان و مال پر اولی بالتصرف ہو ، وہ اس کے بارے میں ولایت مطلقہ رکھتا ہے۔ اس بنا پر انسان کو اس(ولی) اس کے تمام احکام کی موبمو اطاعت کرنی چاہئے اور جس چیز سے وہ منع کرے اس سے باز رہنا چاہئے۔ یہ عہدہ اور منصب ، خدا کی طرف سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو دیا گیا تھا ۔ آپؐ خود ذاتی طور پر ہرگز اس منصب و مقام کے حامل نہیں تھے۔

واضح تر الفاظ میں یوں کہا جائے گا کہ یہ خدائے تعالیٰ ہے جس نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو لوگوں کی جان و مال پر مسلط فرمایا ہے ۔ آپ کو ہر قسم کے امر و نہی کے اختیارات دئے ہیں اور آپؐ کے احکام و اوامر کی مخالفت کو خدا کے احکام کی مخالفت جانا ہے ۔ چونکہ قطعی اور یقینی دلائل سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ اس حدیث میں ''مولیٰ'' کے معنی وہی ہیں جو آیۂ شریفہ میں '' اولیٰ'' کے ہیں، لہذا قدرتی طور پر امیر المؤمنین حضرت علیؑ اسی منصب و مقام کے حامل ہوئے جس کے آیۂ شریفہ کی نص کے مطابق پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم تھے ، یعنی اپنے زمانے میں امت کے پیشوا اور معاشرے کے رہبر اور لوگوں کی جان و مال پر اولی وبالتصرف کا اختیار رکھنے والے اور امامت کا یہی وہ عظیم اور بلند مرتبہ ہے جسے ولایت الہیہ سے تعبیر کیا جاتا ہے (یعنی وہ ولایت جو خدا کی طرف سے بعض خاص افراد کو وسیع پیمانے پر عطا ہوتی ہے)اب ہم وہ قرائن و شواہد بیان کرتے ہیں جن سے پوری طرح ثابت ہوتا ہے کہ اس حدیث میں لفظ '' مولیٰ '' کے معنی تمام امور میں (اولی بالتصرف) اور صاحب اختیار ہونے کے علاوہ کچھ اور نہیں ہے۔ ذیل میں

---
[1] احزاب ۶

ایسے چند شواہد ملاحظہ ہوں:ا۔ غدیر کے تاریخی واقعہ کے دن رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے شاعر حسان بن ثابت حضور اکرمؐ سے اجازت حاصل کرکے کھڑے ہوئے اور پیغمبر اکرمؐ کے بیانات کے مضمون کو اشعار کے سانچے میں ڈھال کر پیش کیا ۔ یہاں قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ اس فصیح ،بلیغ ،اور عربی زبان کے رموز سے واقف شخص نے لفظ ''مولیٰ'' کی جگہ پر امام و ہادی کا لفظ استعمال کیا ہے، ملاحظہ ہو:فقال لہ قم یا علی فاننی رضیتک من بعدی اماماً و ھادیایعنی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے حضرت علیؑ کی طرف رخ کرکے ان سے فرمایا : اٹھو کہ میں نے تمہیں اپنے بعد لوگوں کا امام و ہادی مقرر کردیا ہے'' واضح رہے کہ حسان نے پیغمبرؐ کے کلام میں موجود لفظ '' مولیٰ'' سے امت کی امامت ،پیشوائی اور ہدایت کے علاوہ کوئی اور معنی نہیں لئے ہیں[1]صرف حسان ہی لفظ '' مولیٰ'' سے یہ نہیں سمجھے ، بلکہ اس کے بعد بھی اسلام کے عظیم شعرا جن میں سے اکثراعلیٰ درجے کے شعرا اور بعض عربی زبان کے استاد شمار ہوتے تھےنے بھی اس لفظ سے وہی معنی لئے ہیں جو حسان نے سمجھے تھے،یعنی امت کی امامت و پیشوائی ۔

۲۔ امیر المؤمنینؑ نے معاویہ کو لکھے گئے اپنے چند اشعار میں حدیث غدیر کے بارے میں یوں فرمایا ہے:و اوجب لی ولایتہ علیکم رسول اللہ یوم غدیر خم ''رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے میری ولایت کو تم لوگوں پر غدیر کے دن واجب فرمایا ہے '' علیؑ سے بہتر کون ہوسکتا ہے جو ہمارے لئے حدیث کے حقیقی مفہوم کو واضح کر سکے ؟ جبکہ شیعہ و سنی آپؑ کے علم ،امانتداری اور تقویٰ کے سلسلے میں اتفاق نظر رکھتے ہیں ۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرتؑ حدیث غدیر سے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں '':پیغمبر خداؐ نے غدیر کے دن میری ولایت کو تم لوگوں پر واجب فرمایا ''کیا اس وضاحت سے یہ مطلب نہیں نکلتا ہے کہ غدیر کے دن حاضر تمام لوگوں نے آنحضرتؐ کے بیانات سے دینی سرپرستی اور معاشرے کی رہبری کے علاوہ کوئی اور مفہوم نہیں سمجھا تھا؟

خود حدیث میں ایسے قرائن موجود ہیں جو اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ پیغمبر اسلامؐ کے اس جملہ کا وہی مطلب ،یعنی حضرت علیؑ کا '' اولی بالتصرف'' و صاحب اختیار ہوناہے ۔ کیونکہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے جملہ ''من کنت مولاہ '' فرمانے سے پہلے یوں فرمایا تھا '': الست اولیٰ بکم من انفسکم ''کیا میں تم لوگوں پر تمہارے نفوس سے زیادہ اختیار نہیں رکھتا ہوں ؟اس جملہ میں پیغمبر اکرم صلی

[1] مناقب خوارزمی ص ۸۰ وغیرہ۔

اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ''اولی بکم من انفسکم '' سے استفادہ فرمایا ہے اور اپنے آپ کو تمام لوگوں پر ان کے نفوس سے زیادہ صاحب اختیار بتایا ہے ۔اس کے فوراً بعد فرماتے ہیں : ''من کنت مولاہ فھذا علی مولاہ ''ان دو جملوں کی ترتیب سے ذکر کئے جانے کا مقصد کیا ہے ؟کیا اس سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا مقصد یہ نہیں ہے کہ علیؑ بھی میری طرح لوگوں کے نفوس پر صاحب اختیار ہیں جسے آپؐ نے پہلے اپنے لئے ثابت فرمایا اور یہ جو آپؐ نے فرمایا کہ : ''اے لوگو!وہی منصب و مقام جس کا میں حامل ہوں ، علیؑ بھی اسی منصب کے حامل ہیں ''اگر پیغمبرؐ کا مقصد اس کے علاوہ کچھ اور ہوتا تو اپنی اولویت کے بارے میں پہلے لوگوں سے اقرار لینے کی ضرورت ہی نہیں تھی ۔

۴۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اپنی تقریر کی ابتداء میں لوگوں سے اسلام کے تین اہم اصول (توحید، نبوت ، معاد) کے بارے میں اقرار لیتے ہوئے فرمایا ''أَلَستُم تَشْهَدُون أَن لاإِلٰه إِلَّا اللّٰهُ وَ أَن مُحَمَّداً عَبْدُهُ وَ رَسُولُهُ وَ أَن الْجَنَّةَ حَق وَ النَّارَ حَق ''یعنی ، کیا تم لوگ گواہی نہیں دیتے ہو کہ خدا کے سوا کوئی پروردگار نہیں ہے ، محمدؐ اس کا بندہ اور رسولؐ ہے اور بہشت و جہنم حق ہیں ۔

یہ اقرار لینے کا مقصد کیا ہے ؟کیا اس کا مقصد اس کے علاوہ کچھ اور ہے کہ پیغمبرؐ اسلام لوگوں کے ذہنوں کو اس پر آمادہ کرنا چاہتے تھے کہ علیؑ کے بارے میں جس منصب کا اعلان کرنے والے ہیں وہ انہی اصولوں کے مانند اہم ہے ، اور لوگ جان لیں کہ آپؑ کی ولایت و خلافت کا اقرار اسلام کے مذکورہ تین اصول کے مانند ہے جس کا سب نے اقرار و اعتراف کیا ہے ؟اگر ''مولیٰ ''کا مقصد دوست اور مددگار لیا جائے تو اس صورت میں جملوں کا سلسلہ ہی ٹوٹ جاتا ہے اور پیغمبرؐ کے کلام کی بلاغت و پائداری ختم ہوجاتی ہے ۔ کیونکہ منصب ولایت سے الگ ہٹ کر حضرت علیؑ خود ایسے عظیم مسلمان تھے جنھوں نے ایسے معاشرہ میں پرورش پائی تھی جہاں پر تمام مؤمنوں سے دوستی کی ضرورت کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی چہ جائیکہ علیؑ جیسے مؤمن سے دوستی جسے پیغمبرؐ اس اہتمام و شأن کے ساتھ ایک بڑے اجتماع میں اعلان فرماتے !اور اس صورت میں یہ امر اتنا اہم بھی نہیں تھا کہ اسلام کے تین بنیادی اصولوں کے برابر قرار پاتا ۔

۵ ۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اپنے خطبہ کے آغاز میں اپنی رحلت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں '' : انہ یوشک ان ادعی فاجیب ''قریب ہے کہ میں دعوت حق کو لبیک کہوں'' یہ جملہ اس امر کی حکایت کرتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اپنی رحلت کے بعد کیلئے کوئی اہتمام و اقدام کرنا چاہتے تھے تا کہ اپنے بعد پیدا ہونے والے خلأ کو پر کریں ۔اور بلاشبہ واضح ہے کہ جو چیز اس خلأ کو پر کر سکتی تھی وہ صرف حضرت علیؑ کی خلافت و امامت تھی کہ رسول خداؐ کی رحلت کے بعد امور کی باگ ڈور حضرت علیؑ اپنے ہاتھ میں لے لیں، نہ کہ علیؑ کی محبت و دوستی یا ان کی نصرت و مدد !

٦۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے جملۂ ''من کنت مولاہ'' کے بعد یوں فرمایا :اللہ اکبر علی اکمال الدین و اتمام النعمۃ و رضی الرب برسالتی و الولایۃ لعلی بن ابی طالب میں خدا کی طرف سے تکمیل دین، اتمام نعمت، اپنی رسالت اور علیؑ ابن ابیطالب کی ولایت پر تکبیر کہتا ہوں ۔

۷ ۔ اس سے واضح اور بہتر کیا گواہی ہوسکتی ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے منبر سے نیچے تشریف لانے کے بعد شیخین اور اصحاب رسولؐ کی ایک بڑی جماعت نے حضرت علیؑ کی خدمت میں مبارک باد پیش کی اور مبارک بادی کا یہ سلسلہ سورج ڈوبنے تک جاری رہا؟مزے کی بات یہ ہے کہ شیخین پہلے افراد تھے جنہوں نے امامؑ سے کہا '' :ھنیئاً لک یا علی بن ابی طالب اصبحت و امسیت مولی کل مؤمن و مومنۃ '''' مبارک ہو آپ کو یہ منصب، اے علیؑ! کہ آپ ہر مومن زن و مرد کے مولیٰ ہوگئے''، حقیقت میں حضرت علیؑ اس روز امت کی سرپرستی و رہبری کے علاوہ کسی اور منصب کے مالک نہیں بنے تھے جبھی وہ اس قسم کی مبارکباد کے مستحق قرار پائے اور اسی وجہ سے اس دن ایسے کی بے مثال تقریب اور ایسے عظیم اجتماع کا اہتمام کیا گیا ۔

۸ ۔ اگر مقصد صرف علیؑ کی دوستی کا اعلان تھا تو یہ ضروری نہیں تھا کہ پیغمبر اسلامؐ ایسے موسم گرما میں حجاج کے ایک لاکھ کے مجمع کو رکوا کر اور لوگوں کو تپتی ریت پر بٹھا کر مفصل خطبہ بیان کرتے اور اس کے بعد اس مسئلہ کو پیش کرتے ۔کیا قرآن مجید نے مؤمن افراد کو

ایک دوسرے کا بھائی نہیں پکارا ہے؟جیسا کہ فرمایا ہے: (اِنَّما المؤمنون اِخوة[1]) ' با ایمان لوگ آپس میں ایک دوسرے کے بھائی ہیں''
کیا قرآن مجید نے مؤمنوں کا تعارف ایک دوست کے دوسرے کی حیثیت سے نہیں کرایا ہے.جیسا کہ فرماتا ہے: (وَ المؤمنون وَ المؤمنٰت بَعضُهُم أَولیاء بَعض) ''با ایمان لوگ ایک دوسرے کے دوست ہیں[2]''علی.بھی تو اسی با ایمان معاشرے کی ایک فرد تھے،اس لئے اس کی ضرورت ہی نہیں تھی کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم الگ سے اور وہ بھی اس اہتمام کے ساتھ علی.کی دوستی اور محبت کا اعلان فرماتے جو کچھ ہم نے بیان کیا اس سے بالکل واضح ہوجاتا ہے کہ بعض لوگوں کا یہ دعویٰ،کہ حدیث غدیر کا مقصد علی.کی دوستی یا ان کی نصرت و مدد کو ضروری قرار دینا تھا اور پیغمبر.کے خطبہ میں لفظ ''مولیٰ''دوست یا ناصر کے معنی میں ہے،در حقیقت تعصب پر مبنی ایک قسم کی غیر منصفانہ تفسیر اور بہت بچگانہ باتیں ہیں ۔

گزشتہ قرائن اور اس خطبہ کے اول سے آخر تک بغور مطالعہ کے بعد یہ ناقابل انکار حقیقت معلوم ہوجاتی ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے خطبہ میں ''مولیٰ''کا ایک ہی معنی ہے،یعنی ''صاحب اختیار'' (اولی بالتصرف) ہونا۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ اس کا مقصد سیادت اور آقائی ہے اور مولیٰ ''سید'' کے معنی میں ہے تو اس سیادت کا مقصد وہ دینی والٰہی سیادت ہے جو امام کی اطاعت کو لوگوں پر واجب اور ضروری قرار دیتی ہے۔

[1] حجرات / ۱۵
[2] توبہ / ۷۱